

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

روزنامہ ٹائمز آف کراچی نے اپنا ایک مطبوعہ ادارہ (مورتنہ ۷ دسمبر ۱۹۵۲ء) ”ترجمان“ میں اشاعت اور تبصرے کے لیے چھوڑا تھا۔ اس ادارے پر ہمارا مفصل تبصرہ ”تسیم“ میں شائع ہو چکا ہے۔ روزنامہ مذکور کے مدیر شہیر نے، نیز حکمہ تعلقات عامہ پنجاب نے اس ادارے کی پریس میں وسیع پیمانے پر اشاعت کی کوشش کی ہے۔ ہم اس ادارے پر اپنے جوابی تبصرے کو ”ترجمان“ میں بھی نقل کر رہے ہیں تاکہ ہمارے نقطہ نظر سے امکانی حد تک زیادہ سے زیادہ لوگ آگاہ ہو جائیں۔ ہم پہلے ٹائمز آف کراچی کے ادارے کا وہ مستند ترجمہ دیں گے جسے حکمہ تعلقات نے اخبارات کو مہیا کرنے کی زحمت گوارا کی ہے۔ بعد میں اپنا تبصرہ نقل کیا جائے گا۔

ٹائمز آف کراچی کا ادارہ

(اسلام کے نام پر)

انجمن الاخوان المسلمون اور اس کے قائد جناب حسن الہضیبی جنہیں عرفیہ کی سزا دی گئی ہے، کا المناک انجام غایت درجہ افسوسناک اور غم انگیز واقعہ ہے۔ لیکن اس سانحہ کا پس منظر پوری طرح سمجھنے میں حزم و احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ یہ مسئلہ ایسے اخلاقی اصول کا منظر ہے جسے عالم اسلام میں سہمہ گیر وسعت حاصل ہے۔

جب مغربی حاکمیت و تفوق میں ایک مدت کی گیلٹی کے بعد نازل پیدا ہونا شروع ہو گیا تو اسلامی تصورات کا از سر نو جنم لینا ایک فطری بات تھی۔ الاخوان المسلمون کا وجود اس نشاۃ ثانیہ کے مظاہرات کا ایک مہین ثبوت تھا جس کی بنا پر اس جماعت کا قومی بیداری کی تحریک سے گہرا اثر قائم ہو گیا۔ غیر ملکی حکومت دو لحاظ سے اسلام کے منافی تھی۔ ایک

اس معنی میں کہ اس نے اسلامی اسلوبِ فکر پر ایک غیر ملکی تمدن ٹھونسنے میں عامۃ المسلمین کے جذبات کو کچلنے کی سعی کی، چنانچہ اس قسم کی تحریکوں نے ایران، انڈونیشیا اور دیگر ملکوں میں سر اٹھانا شروع کر دیا اور غیر ملکی اثر سے غلصی پانے کے سلسلہ میں جنگ کے بعد عام سیاسی بیداری نے جو صورت اختیار کی اس کا خوشگوار ترین ثبوت پاکستان کے منصف شہود پر آنے سے ملتا ہے۔ جہاں تک برطانیہ سے مخالفت کا تعلق ہے پاکستان کے قیام سے نہ صرف قومیت کی تمنائیں اجاگر ہو گئی تھیں بلکہ اس کا وجود اسلام سے گہری شیفتگی کا منظر بھی بن گیا تھا اور اس لحاظ سے مسلمانوں میں سیاسی بیداری ہندوؤں کے مطالبہ آزادی سے جداگانہ حیثیت کی حامل تھی۔ اس قسم کی تحریکات غیر ملکی طاقتوں کے خلاف ایک بھرپور قوت پر مشتمل تھیں لیکن غیر ملکی انداز کے اٹھ جانے کے بعد ان تحریکوں نے انتہائی اہمیت کے معاشرتی معاملات کو بھی اپنے حیطہ اختیار میں لے لیا۔ شاہ فاروق کی تخت برداری پر، جو بد عنوانیوں اور غیر ملکی مفادات کا نقیب بن گیا تھا، عوام کی طرف سے بجا طور پر قومی حسرت منبیا گیا۔ اس موقع پر انجمن الاخوان المسلمون فوج کی حلیف بن گئی تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس انقلاب کے علمبردار انخوان ہی قرار دیئے گئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فوج نے مصر میں انقلاب لانے کے لیے اس جماعت پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کے سوابقانی تمام سیاسی جماعتوں کو ختم کر دیا جس کے نتیجے میں جناب حسن البھضبی کی ملکی حالات و واقعات پر اپنا لیے پناہ اثر استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے حالات کی موجودگی میں وہ نتیجہ کیوں برآمد نہیں ہوا جس کی خواہش اور توقع کی جاتی تھی؟ وہ کیا چیز ہے جس نے انجمن الاخوان المسلمون اور انقلابی کونسل کو ایک دوسرے سے دست بگریباں کر دیا اور اس باہمی آویزش سے ملک کے اندر طوائف الملوک کا دور دورہ شروع ہو گیا اور سیرونی ممالک میں اس کے وفار کو شدید ضرب پہنچنے لگی۔

بادی النظر میں اس دھاندلی کا سبب نرسوزیر کا نفعیہ ہے۔ کرنل ناصر نے حکومت برطانیہ سے جو معاہدہ طے کیا ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ معاہدہ ملکی مفادات کے منافی ہے لیکن اس سلسلہ میں جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ عجزِ حذبیت کے آئینہ دار ہیں۔ کیا کوئی بھی ایسا انسان ہے جو یہ چاہتا ہو کہ وہ دوسروں کی غلامی میں رہے یا عذرتِ نفس کی قیمت سے محروم ہو کر کسی دوسرے کا مطیع و منقاد ہو جائے؟ لیکن سیاست اور ڈپلومسی میں اس بات کے امکانات پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ موقع شناسی اور سیاسی تدبیر کے ماتحت مصری حکومت نے بدترین حالات میں بھی زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اگر مصری اس قابل ہوتے کہ وہ ملک سے انگریزوں کو نکال مہا ہر کرتے تو اتنی مدت تک عجز

لفظی اور استدلال میں وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ انہیں متحدہ نے بھی اس صورتِ حال کی اصلاح میں کوئی قابل ذکر مدد نہیں کی۔ ایسے نامساعد حالات میں کرنل ناصر نے مصر سے برطانیہ کے اخراج میں جو کامیابی حاصل کی ہے وہ بجائے خود ایک شاندار کارنامہ ہے۔ عام طور پر اس معاہدہ کے متعلق یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں تسلیم کیا گیا ہے کہ اگر وسیع پیمانے پر دوبارہ جنگ چھڑ جائے تو برطانیہ دوسری مغربی طاقتوں کی حمایت و اعانت سے نہر سوئز کو اپنے تصرف میں لاسکتا ہے لیکن یہ تو ایسی بات ہے جیسے روس کی طرف سے حملہ ہونے پر امریکہ اپنی فوجیں برطانیہ، فرانس یا جرمنی کی امداد کے لیے ان ملکوں میں داخل کرے۔ اکیلا مصر اپنی مداخلت نہیں کر سکتا اور یہ مصری پر کیا موقوف ہے، کوئی بھی ملک اپنی حفاظت خود کرنے کا اہل نہیں تا وقتیکہ وہ غیر جانب دار رہنے کا متمنی نہ ہو لیکن لفظی دعوؤں اور جنگ سے الگ رہنے کی خواہش کے باوجود کسی ملک کا غیر جانب دار رہنا ممکن ہی نہیں بلکہ اسلامی مفادات کے لفظ نظر سے لیا کرنا موزوں نہیں ہے۔ مغربی ممالک اور انٹرنیٹ کی دنیا کے درمیان جنگ چھڑ جانے پر فرزند انِ اسلام کے انتخاب کے متعلق کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ خواہ ہم ان دونوں طاقتوں میں سے کسی ایک کا حلیف ہونا پسند کریں یا نہ کریں۔

اس مطمح نظر کے علی الرغم مذکورہ معاہدہ کی رو سے مصر میں صنعتی ترقی اور اندرونی استحکام جیسے ضروری مقاصد کے لیے راستہ ہموار ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ زیر نظر معاہدہ کے مطابق مصر کو بین الاقوامی معاملات میں ایک وسیع حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ان حالات کے پیش نظر اس معاہدہ کے فائدے سے مصر کہیں زیادہ متمتع ہو سکتا ہے۔

الانخوان المسلمون نے جس ثوقی مگر خیالی معرکے کا خدشہ ظاہر کیا ہے وہ نہر سوئز کے معاہدہ کے تفسیر سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ عوام کے احساسات اور اصل حالات سے ناواقفیت کی بنا پر ہر پیمیلہ کسی وقت بھی مصر کی موجودہ حکومت پر اعتراض یا نکتہ چینی کرتے کے لیے سب کو متحد و مچھال بنانے کے لیے ایک بہترین موضوع قرار پا سکتا ہے۔ اس قسم کا شائبہ کھڑا کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ ہم نے پہلے بتا دیا ہے کہ انقلاب مصر کے آغاز میں الانخوان المسلمون کی جماعت نئی حکومت کے حامیوں میں سے تھی اور یہ جماعت ان واقعات کے رونما ہونے تک نئی حکومت کا ساتھ دیتی رہی جو اس سال مارچ کے دوران جنرل نجیب اور کرنل ناصر کے درمیان پہلی بھر پور پرنسپل ہوئے۔ انقلابی حکومت اس جماعت کی ہدایت اور رہنمائی قبول کرنے کے لیے تیار تھی۔ حالات اس بات کے گواہ ہیں کہ اس جماعت کا میدان سیاست میں کوئی حریف نہ رہا تھا پھر وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے جماعت اور اس کے قائد کو اپنا پروگرام بروئے کار لانے کا موقع نہ دیا۔ جہت ہے

کہ نہر سوئیز کے معاہدہ کے سوا جسے پوشیدہ اغراض کے حصول کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے، حکومت الاخوان المسلمون کے مابین تنازع یا جھگڑے کے متعلق کبھی کوئی خبر سننے میں نہیں آئی۔ اس پر منظر کی موجودگی میں حکومت اور اخوان کا تصادم مفروضہ بلکہ بے معنی ہوتا ہے اس معاہدہ پر جس قدر غور کیا جائے الاخوان المسلمون کی طرف سے منفی رویہ اختیار کرنے میں کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

اس باب میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ سارا نزارع سیاسی اقتدار کے حصول کا ہے جس اہمیتی چاہتے ہیں کہ اقتدار و اختیارات کی عنان ان کے ہاتھ میں آجائے۔ مصر اور مصری حکومت کو اس مسلح بغاوت کا سامنا کرنا پڑا ہے جس کا تمام تر مقصد یہ ہے کہ اقتدار اور قوت حاصل کرنے کے لیے سر دھڑکی بازی لگا دی جائے اس قسم کے دہشت انگیز طریقے انتہا پسند اور بزم خودی برصداقت تحریکوں کے مزاج میں رچے ہوئے ہیں۔ ایسی تحریکیں اعتدال پسندی، فراخ دل اور مصلحت کے جذبہ سے خالی ہوتی ہیں حالانکہ یہی جذبہ قومی تعمیر و ترقی کے تدریج اور صبر آزما مساعی کا سرچشمہ ہے جس کی بدولت ملک مغربی ثقافت سائنس اور سیاست کی عظیم روایات سے کما حقہ مستفیض ہو سکتا ہے۔

آپ ہی کہیے ایسی کون سی حکومت ہوگی جو بغاوت کو برداشت کر لے گی۔ لہذا اگر مل ناصر کی حکومت نے جو کچھ کیا ہے وہ ناگزیر تھا کیونکہ اس حکومت کے لیے ہر حالت میں اپنی ممانعت کرنا ضروری تھا۔ موجودہ صورت حال کا سارا الزام ان لوگوں پر عائد ہونا ہے جنہوں نے ملک کے وسیع مفاد کی ذرہ بھر پروا نہ کی اور جن کے خیال کے مطابق ان کی دیانت و ایمان داری کے حصار ہی میں اسلام کی ترقی و سر بلندی محفوظ تھی۔ حالانکہ یہ لوگ قومی نظریات کی برتری کے علم میں ملک کو افراتفری اور لافٹونی کے غار میں دھکیل دینے کے لیے کمر بستہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ کچھ افراد کے دردناک انجام سے قطع نظر مصر کے عام ہی خواہ بالخصوص اسلامی ممالک میں مصر سے خیر سگالی کا جذبہ رکھنے والے اصحاب موجودہ مصری حکومت کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنے سے کیسے باز رہ سکتے ہیں۔ ہم مصر کو زندہ و سلامت اور دن بدن طاقت ور ملک دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔

مصر میں حالات نے جو نیچ اختیار کی ہے، وہ ہمارے لیے سبق آموز ہے۔ تاریخ اسلام میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جن میں بعض افراد نے جو معنی شکل میں اپنے مذہبی اور اخلاقی عقائد کی دھن میں ایک باقاعدہ اور منظم نظام کے خلاف بغاوت بلند کر دیا لیکن اس قسم کی کوششیں کبھی مفید ثابت نہیں ہوئیں۔ اس قسم کے اقدام سے اگر کبھی ایک حکومت کی بجائے کسی

دوسری حکومت مجھے جگہ لی تھی، تو اس سے خیالات نے کوئی دائمی اثر قبول نہیں کیا، جو سماج، رواداری اور فراخ صوگی کی تلقین کرتا ہے، اس کی مساعی ہمیشہ بار آور ہوتی ہیں، اس طرح کے سارے معاشرے میں رواداری کو نمایاں حیثیت حاصل نہی ہے اور وہاں معاشرتی تصورات خیالات کے باہمی تبادلے اور تاثر سے تغیر پذیر ہوئے ہیں، اس کی مثال برطانیہ کے معاشری وسائبر ہیں، جن میں مسلسل تغیر ہوتا رہا ہے۔ یہ تغیر معاشری اور اخلاقیاتی تفکر کے تازہ ترین اثرات کی نشانی میں وجود میں آتا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں بڑے حزم و احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ پاکستان کو بھی اس قسم کی پرورش اور گمراہ کن تحریکوں کا اندیشہ ہے۔ یہاں بھی مبینہ مذہبی بنیادوں پر شور و شین برپا کی جا چکی ہیں۔ جن کا نتیجہ سخت تباہ کن ثابت ہوا ہے۔ قادیانیوں کے خلاف تحریک کی اصلیت کچھ بھی ہو لیکن یہ کہنا پڑے گا کہ اس تحریک نے حکومت کے خلاف ایک کھلی بغاوت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس تحریک نے تمام پنجاب میں پھیل پیدا کر دی اور صوبے کا سارا انتظام متزلزل ہو کے رہ گیا جس کے ساتھ قتل و غارت گری اور ہیمانہ کارروائیوں کا بازار گرم ہو گیا۔ اور جہاں لوگوں کا بھی مذہبی دست نقصان ہوا۔ اس تحریک کے حسن و قبح کو جانچنے کا یہ معیار نہیں ہے کہ اس میں کسی نظریہ یا عقیدہ کا سوال پیدا ہو گیا تھا، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ اس سے ملک کس حد تک متاثر ہوا؟ کسی منظم اور مربوط معاشرے میں کسی فرد یا گروہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے عقائد کے افراد پر اپنے خیالات اور عقائد کو برہنہ کر دے۔ یہ ضروری ہے کہ جملہ تحریکیں اٹنی مساعی تک ہی محدود رہیں کسی مذہب سوسائٹی کے نزدیک برہنہ تحریک کو برا خیال کیا جاتا ہے جو ملک کی تباہی کا موجب ہو، خواہ اس کے مقصد اپنی جگہ کتنے ہی مخلصانہ کیوں نہ ہوں قتل بہر حال قتل ہے، خواہ یہ محبت و خلوص کے جذبہ سے پیدا ہو یا عقائد و کلمہ کے ماتحت عمل میں آئے۔

ہمارے ملک میں اسلامی مملکت کے تصور اور تشکیل کے متعلق کافی بحث جاری رہی ہے، یہ کہنا کہ ہندوستان کے مسلمان کچھ اس قسم کی مملکت چاہتے تھے ایک تاریخی حقیقت ہے کیونکہ وہ اس کے حصول کے لیے نبرد آزما رہے ہیں، انہوں نے اس کے لیے مشکلیں برداشت کیں، اور قربانیاں دی ہیں، پاکستان میں غیر مسلم فرقے موجود ہوں یا نہ ہوں۔ یہ مملکت بدرجہ اتم ایک اسلامی مملکت ہے کیونکہ اس مملکت کا قیام مسلمانوں اور صرف مسلمانوں کے عزم و استقلال سے ہی ممکن ہے۔ اس اصطلاح کا وسیع تر مفہوم بھی یہی ہے اس پر کوئی جھگڑا پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس مسئلہ پر بحث و تمحیص اور

اور لے دے ہوتی رہی ہے، مگر معمولی حد تک اس ضمن میں یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ اسلامی مملکت کی تعریف کیا ہے؟ اس سوال کا وسیع اور عام الفاظ میں یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ کوئی ایسی مملکت جس پر مسلمان حکمران ہوں، وہ اسلامی مملکت کہلاتی ہے۔ علمی شعوری اور آئینی اصطلاح میں اس قسم کا مسئلہ خالصتاً رائے اور ذاتی نقطہ نظر کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ چونکہ اسلام میں کلیسائی نظام کا وجود نہیں، اس لیے اس کی ریاست میں مذہبی پیشواؤں کا ادارہ بھی نہیں جیسے ایسے مسئلے پر فتویٰ دینے کی پوزیشن حاصل ہوتی ہے۔ عوام زیادہ سے زیادہ علماء کے علم و فضل سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ مولانا مودودی یا مولانا احتشام الحق کی فہم کے لوگوں کے اس دعوے سے عام گڑ بڑ پیدا ہوئی کہ ان کی رائے مستند اور صاحب ہے۔ جس کے سامنے لوگوں کو سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ اس قسم کے مذہبی عقائد کے کئی مکتب خیالی ہیں جو ایک دوسرے سے یہم برسر پیکار رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے ایک گروہ یا دوسرے گروہ کی رائے واجب التعظیم اور ثقہ کیوں تسلیم کی جائے، جب کہ اسلام اس کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ ہماری سوسائٹی جیسے وسیع الجہاں معاشرے کے لیے جو ملائیت کے بندھنوں سے آزاد ہے یہ کہیں موزوں ہے کہ اس مسئلہ کو اصول اجماع کے مطابق تمام مسلمانوں کے سامنے رکھا جائے اور ان لوگوں کی مداخلت سے جو اس مسئلہ پر کامل دسترس رکھتے ہوں، عوام کے مختلف عقائد پر مائل کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں اسلامی مملکت قائم کیے جانے کے سوال پر بحث اس لیے پیدا نہیں ہوئی کہ اس کی موزونیت پر کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا بلکہ اسلامی مملکت کی صحیح تشکیل کے سلسلہ میں جو اجارہ دارانہ نوعیت کے مطالبات پیش کیے گئے تھے ان پر بحث مباحثہ شروع ہو گیا تھا اس شور و شغب میں جماعت اسلامی پیش پیش تھی۔ یہ اسلوب فکر ملک کے لیے ناہ کن نتائج کا حامل ہے، عوام کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ ایک مشورہ یا دوسرے مشورہ پر کان دھریں۔ یا ان میں سے کسی ایک کو ٹھکرا دیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ آخری اختیار عوام ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اسلام کے متعلق مشترک اور متحدہ طور پر رائے زنی کرنے اور انہام و تہم کے لیے موجودہ وقت کے پارلیمانی اداروں میں بحث مباحثے کے بہتر مواقع میسر آسکتے ہیں۔ اس بحث سے دو نتائج برآمد ہوتے ہیں ہمارے خیال میں ایک مسلم معاشرے میں کسی شخص کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ مختلف عناصر کو مجتمع کرنے کی غرض سے اسلام کے نام پر سیاسی جماعتوں کو معرض وجود میں لائے۔ خواہ ان جماعتوں کا پروگرام سماجی اور اخلاقی بہبود کے اسلامی مقاصد سے آراستہ کیا جاسکتا ہو۔ ریاست

مولانا کا لفظ سلمہ کی صاحب کے اس ادارے میں نہیں ہے، معلوم نہیں ترجمے میں یہ اضافہ کس لیے کیا گیا ہے (ترجمان)

یہ عام بات ہے کہ سیاسی جماعتیں نکتہ چینی، باہمی آویزش اور دشنام طرازی میں مصروف ہیں۔ انگلستان میں ٹوری جماعت سوشلسٹوں کو فتنہ پرداز، بدامنی پسند اور بچو قسم کا مورد قرار دے سکتی ہے اور اس کے جواب میں قدامت پسندوں پر ریٹنر کی جاہلیگی ہے کہ وہ نسقی القلب، سر باہ پرست ہیں، اب بتائیے کہ جماعت اسلامی جیسی کوئی جماعت اسلام کا پرچم اٹھائے اپنے مخالفوں کو کس نام سے یاد کر سکتی ہے۔ یہی ناکہ جو لوگ اس جماعت کے حلقہ بگوش نہیں انہیں کافر و ملحد وغیرہ کے خطابات سے نوازا جاسکتا ہے اور حقیقت میں اس قسم کی اصطلاحات کا استعمال جماعت اسلامی کی طرف سے آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ اس جماعت کے ترجمان نے ان لوگوں کو اس قسم کے خطابات سے یاد کیا ہے جو موجودہ دستور میں ترمیم کے خواہشمند تھے، مسلم معاشرے میں ایسی صورت حال کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی مسلمان کو کافر کہے۔ جماعت اسلامی ان شخص کو خارج از اسلام قرار دیتی ہے جو اس کے حلقہ تکلیف میں داخل نہیں۔ اس نظریے کی قانونی طور پر مخالفت کی جانی چاہیے۔ لیکن یہ پابندی ان مذہبی اور تعلیمی اداروں یا جماعتوں کا عائد نہیں کی جانی چاہیے جن کا مقصد و مدعا یہ ہو کہ عوام کو اسلام اور اس کی قدروں سے روشناس کرایا جائے۔ ہمارا اعتراض صرف سیاسی جماعتوں کے متعلق ہے۔

دوسرا نتیجہ اس بات پر اثر انداز ہونا ہے جو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں یعنی کسی ایک کی رائے سے زیادہ قابل قبول کیوں ہو؟ اسی بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو عملیت موجود ہے اس کی سزا اور معیار کیا ہے۔ رائے اور نظریہ بہت حد تک ماحول پر منحصر ہوتا ہے غیر ملکی حکومت لازماً ذہنوں کو متاثر کرے گی۔ لہذا یہ شاذ و نادر ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں قطعاً آزادانہ روش کے مفکر پیدا ہوں۔ اقبال ایک ایسے مفکر میں وہ ہر شے پر الکیا طنی مسلم زاویے سے نظر ڈالتے ہیں۔ لیکن ان کی اعانت ایک اور حقیقت بھی نکلتی تھی۔ اور وہ مغربی تمدن کی روح سے ان کی کامل آگاہی اور اس کا لامحدود علم تھا۔ اسلامی مقامات نظر کی پوری روشنی رکھتے ہوئے وہ مغربی اقدار کو نہایت آزادانہ طریقے سے پرکھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ انہوں نے عمر بھر مذہبوں اور تمدنوں کا مطالعہ و موازنہ کیا، وہ جن نتائج پر پہنچے وہ قطعاً ان کے اپنے تھے۔ اس پر بھی انہوں نے باوضاحت یہ بات کہی ہے کہ دوسرے لوگ جو زیادہ اہلیت کے مالک ہو سکتے ہیں، نئے مقامات نظر سے آغاز کریں۔ لہذا دوشرکاء مستدر لے دینے کے لیے ضروری ہے۔ پہلی یہ کہ ہم چونکہ ابھی غیر ملکی حکومت سے آزاد ہوئے ہیں اس لیے اس کے سیاسی و فکری اثرات ابھی باقی ہیں۔ جو لوگ ہم میں

بہت ممتاز ہیں وہ یہی کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی بات پر کسی نہ کسی مغربی عالم کا سوال دے چھوڑتے ہیں۔ بالعموم حالت یہی ہے لیکن جو لوگ مستدرائے رکھنے کے دعوے دار ہیں، ان کا تقدیم علم بہت ہی کم ہے۔ مثلاً کسی مودودی یا احتشام الحق کا سرمایہ علم کتنا ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں کوئی شخص یقینی طور پر یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ اپنے حلقہ علم میں کتنی استعداد رکھتے ہیں لیکن وہ وقت کے تقاضوں سے یقیناً اور قطعی طور پر بے بہرہ ہیں جس میں وہ زندگی گزار رہے ہیں اور جس میں ہمارا اسلامی معاشرے کا تجربہ جاری ہے۔ قرآن کریم کو محض عربی زبان ہی میں نہیں سمجھا جاسکتا بلکہ اس کے ادراک کے لیے انسان کے تمام ذخیرہ علم اور روز افزوں معلومات کی روشنی درکار ہے کیونکہ یہ مقدس کتاب انسانی معاملات پر روشنی ڈالتی ہے جس کے نتیجے میں اس کی روحانی حقیقت پس منظر ہونا چاہیے۔ اسلام کا ادراک اتنے ذخیرہ علم کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اسے ایک معاشرتی اور سیاسی نیچ پر ڈالنا اور بھی دشوار ہے۔

لہذا ہمارا مشورہ یہی ہے کہ ہمیں آج کی دنیا کو سمجھنے میں استقلال اور مسلسل کاوش سے کام لینا چاہیے۔ جوں جوں وقت گزرے گا اور ہمیں اپنی سیاسی آزادی میں زیادہ اعتماد اور ادراک حاصل ہوگا، ہم آراء قائم کرنے کے زیادہ اہل بنیں گے اور اس کے ساتھ ہمیں بات پر زور دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ قرآن کریم سے زیادہ مطالعہ کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی اسلامی وحدت پر یقین رکھتے ہوئے علم جدید حاصل کیا جائے کیونکہ اسلام مادی اور روحانی، دنیاوی اور مادی دنیا کی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا۔ جب ایسے علم سے آراستہ لوگ زیادہ تعداد میں پیدا ہوں گے تو معاشرے پر لازماً ان کا اثر ہوگا جس سے عیسائی قانون ساز بھی خارج نہیں۔ جو بلند تر ہوتے ہوئے تفکر کے درجہ کے مطابق بنائے گی جس طرح معاشرہ افراد کی تنگ و دو سے بہتر ہو جاتا ہے اسی طرح وہ افراد کی فراست سے زیادہ باشعور بھی ہو جائے گا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس عمل کا اجرا کریں کیونکہ ہمیں علم کی بے حد ضرورت ہے۔ قومی ترقی کے اس مرحلے پر ہمیں جو اپنا فرض سمجھنا چاہیے وہ اول تو یہ ہے کہ ہم آئندہ نسلوں کے لیے ایک مضبوط اور بہتر اعتبار سے مجتمع ملک چھوڑیں۔ دوسرے انہیں علم کا کچھ نہ کچھ ذخیرہ دیں جو ان کے کام آئے۔ بجائے اس کے کہ انہیں محدود ذہن اور محض جہالت سے پیدا شدہ بندھی ہوئی آراء دے دی جائیں۔ ہمیں ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم آئندہ نسلوں کو نام نہاد اسلامی قوانین میں جکڑ دیں جو نیم چمپتہ خیالات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ وہ شخص جو ہمارے علماء کو انکسار کا درس دے گا اسلام کا سب سے بڑا خادم ہوگا۔

اداریے پر تبصرہ

یہ تحریر بہت سی متفرق اور ادھوری بحثوں کی جامع ہے۔ بڑی عنایت سے اس کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم ان متفرق بحثوں کو چار حصوں میں بانٹ سکے ہیں۔ ایک حصے میں سلمی صاحب نے مصر کی افسوسناک صورت حال کا جائزہ لیا ہے اور یہ جائزہ چند اہم نتائج تک پہنچنے اور پاکستان کے لیے بیش قیمت سبق حاصل کرنے کے ارادے سے لیا ہے۔ دوسرے حصے میں پاکستان کی نظریاتی نصاب کا تجزیہ کر کے یہ دکھایا ہے کہ یہاں بھی من و عن وہی صورتِ حالات سامنے ہے جیسی کہ مصر کے درپیش ہے، لہذا اس سے عمدہ براہونے کے لیے کچھ ایسی ہی تدابیر عمل میں لانی پڑیں گی جیسی مصر میں لانی جا رہی ہیں۔ تیسرے حصے میں اسلامی ریاست کے تصور پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے کہ وہ کیا ہوتی ہے اور پاکستان کن معنوں میں اسلامی ریاست ہے۔ چوتھے حصے میں جاسٹ اسلامی پر خاص نگاہِ کرم فرمائی گئی ہے اور اربابِ اقتدار کو مشورہ دیا گیا ہے کہ اس "خطرے" سے عمدہ براہونے کے لیے کیا اقدام ضروری ہے۔ اسی ترتیب سے ہم بحث کے ایک ایک حصے پر اپنا تبصرہ پیش کرتے ہیں۔

(۱)

مصر کی فوجی آمریت اور اخوان | اخوان آج جس انتہائی مظلومانہ انتہا میں سے گذر رہے ہیں اس کی اتنے بڑے پیمانے کی کوئی مثال نہ صرف یہ کہ ہمیں اپنی تاریخ کے نہایت افسوسناک اور اذتک میں نہیں ملتی، بلکہ ایشیائی، خصوصاً مسلمان ممالک کے مغربی قبوں کے جاہلانہ سامراج نے بھی پچھلی دو صدیوں میں ایسے بے باکانہ استبداد کی کوئی نظیر قائم کر کے نہیں چھوڑی۔ خود اس خطرہ ہند میں برطانیہ نے ہم مسلمانوں کے ہاتھ سے سلطنت کی باگ ڈور چھیننے میں بڑی سخت سخت کارروائیاں کی ہیں لیکن ان غیروں نے بھی اس کارنامے کی نکرہ کا کوئی خونین کارنامہ سرانجام نہیں دیا جس سے آج اپوں نے تاریخ کو ملامت کر دیا ہے۔ اس سانحہ عظیم پر چونکہ کوہِ ارض کے ہر گوشے میں مسلمانوں کے زخمی کلیجوں سے خون ٹپک رہا ہے اس لیے دنیا بھر میں یہ واقعہ ریاست اور صحافت کے میدانوں میں نمایاں ترین موضوع بحث بنا ہوا ہے۔

غورزی دبر کے لیے اس سے قطع نظر کہیجے کہ مصر کی فوجی آمریت اور اخوان میں سے کون حق پر ہے اور کون

برسر غلط ہے ، یا دونوں تصور وار ہیں تو کس کا حصہ لگتا ہے ۔ بلکہ اُنٹا ہی طے کر لیجیے کہ انوان محرم ہیں ، سو فیصدی محرم ہیں اور ناقابلِ عفو محرم ہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ عدل و انصاف کے کم سے کم معیار کا جو تصور انسانیت کے اجتماعی ضمیر میں پرست ہے ، کیا اس معیار پر مہر کی آمریت کے اقدامات پورے اترتے ہیں اور دیکھنے والا مطمئن ہو سکتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے ۔

سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آمریت — اور فوجی آمریت — کا تخت بچھا ہے اور اس پر ایک طاقت جھوٹا جس کی محض اپنی مرضی دستور ، جس کا صرف اپنا ہی حکم قانون ، اور جس کا فقط اپنا ہی فیصلہ پالیسی قرار پاتا ہے ۔ پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ آمریت تنگامی حالات کے جس اعلان سے دستوری اور جمہوری دفعا کا خاتمہ کرتی ہے اسے ایک لمبے عرصے کے لیے ملک کی تقدیر بنا دیتی ہے ۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ رائے عام کی ترجمانی کر سکتے والی تمام پارٹیاں میدان سے ہٹا دی جاتی ہیں ۔ پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اختلافی نقطہ نظر رکھنے والے اخبارات ، تمام کے تمام بند کر دئے جاتے ہیں اور پریس پر مستقل سانس بٹھا دیا جاتا ہے ۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایسے دہشت ناک ماحول میں اتوان کو محض نقطہ نظر کے اختلاف کی بنا پر موجودہ واقعات بہت قبل کھلی کھلی دھمکیاں دو جاتی ہیں ۔ گویا یہ بات موجودہ واقعات سے قبل طے ہو جاتی ہے کہ ان لوگوں کو ختم کرنا ۔ پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے خلاف مختلف الزامات مائد کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ، درآنحالیکہ وہ زبردستی کرنے کے لیے ذرائع و وسائل سے محروم ہیں ۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انوان کو کسی عدالتی فیصلے کے بغیر خلاف قانون قرار دے کر کثرت سے گرفتاریاں کر لی جاتی ہیں ۔ لیکن اتنے بھر پور وار سے خیالات کی وہ رد نہیں بنتی جو انوان کی تحریک لے کٹی برس کی محنت سے پیدا کی ہے ۔ پھر ہم یہ دیکھتے ہیں ناصر پر ایک انوکھے انداز سے قاتلانہ حملہ ہوتا ہے جس کی شاید کوئی ایک نظیر بھی قاتلانہ حملوں کی تاریخ میں نہ مل سکے ۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نین جملے کے وقت ناصر پکارتے ہیں کہ پکڑو ، یہ کوئی انوانی ہے ۔ پھر چند گھنٹوں کے اندر اندر طے ہو جاتا ہے کہ اس جملے کے نتیجے میں ایک وسیع سازش کام کر رہی ہے ۔ چنانچہ دل کھول کر گرفتاریاں کر لی جاتی ہیں

اور سرکاری انتظام سے انہوں کو کام کرنی دینا شروع کر دیا جاتا ہے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فوجی عدالت بٹھائی جاتی ہے، اور ایسی نرالی فوجی عدالت بٹھائی جاتی ہے جس کی تفساح کی منڈلی خود وہی وزراء کے کرام جلد فرما ہوتے ہیں جو برسرِ عام انہوں کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار پہلے سے کرتے رہے ہیں۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ عدالت آدھ آدھ گھنٹے کی کارروائی کر کے اتوان کے کلام ترین افراد کو خوب دل کھول کر بچانی اور عجز و نڈکی سننا میں سناقتی ہے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بغیر کسی شاہدہ رحم سے کام لے، یا مسلمان عالم کے جذبات علی کا کوئی لحاظ کئے، پوری شانِ منگولی کے ساتھ جلد جلد یہ سناقتیں نافذ کر دی جاتی ہیں۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ظلم کی اس چکی میں اپنے کے لیے ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کھینچ ان لوگوں کو لائی جاتی لگتی ہے جس کو انہوں ہونے کے جرم میں پکڑا جاتا ہے۔

یہ ساری صورتِ حالات جس کا ایک ایک جزو ایسا ہے جو اسلام، جمہوریت اور عام انسانی تصور انصاف سے کھلم کھلا ٹکراتا ہے، ہر سو پیکرِ آبِ دگل کو۔ بلا لحاظ اس کے کہ وہ انہوں سے اختلاف رکھتا ہو یا اتفاق کرے۔۔۔ سر سے پاؤں تک ہلا ڈالنے والی ہے۔ ایسے واقعات انسانیت کی کھچلی تالیخ میں سو گزرے ہوں، یا آج پیش آئے ہوں، مسلمان ان سے دوچار ہوں یا غیر مسلم، کمیونزم کے زیر اقتدار نمودار ہوں یا سرمایہ داری کی چھپاؤں میں، مشرق میں ہوں یا مغرب میں، ہمارے دوستوں کو ان سے سابقہ پڑے یا مخالفوں کو، انسانی فطرت ہر صورت میں ان پر یکساں کرب محسوس کرتی ہے۔ یہ ٹھیک ایسی ہی صورت ہے جیسے آپ کے محلے کا کوئی آدمی حویلی کا دروازہ بند کر لے، اپنے کسی مانت مشرک کار کے ہاتھ پاؤں باندھ لے، اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دے اور پھر خود ہی الزام لگانے والا مدعی ہو، پھر خود ہی قاضی بن کر ایک سنا سنائے، اور آخر میں خود ہی جلا دین کر کوڑوں سے اس کی چھڑی ادھیڑنے کے درپے ہو جائے۔ محلے میں اپنے خلاف اضطراب پھیلنے کی روک تھام کے لیے وہ یہ تدبیر بھی اختیار کرے کہ اپنے نوکروں کے ذریعے پرچے لکھ لکھ کر اپنے حق بجانب ہونے اور مشرک کار کے سنگین مجرم ہونے کے دلائل ان کو فراہم کرے۔ اگر آپ کے اپنے پڑوں میں کسی فرد کو اس طرح کے ظلم کا شکار بنایا جا رہا ہو تو اپنے قلب کے بارے میں آپ کا اندازہ

کیا ہے کہ وہ نگھلے گا یا نہیں؟ اس سے آگے بڑھ کر اگر یہی صورت کسی جماعت یا تحریک کو کسی حکومت کے نیچے پیش آجائے تو یہ ایک فرد کی مظلومی سے ہزاروں گنا وسیع دائرہ اثر رکھتی ہے اور سوائے پتھر اور لوہے کے عمبوں کے اور کوئی اس پر بے چین ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مگر استثنیٰ ہر عمومیت میں ضرور نکلا آتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمارے اندر موجود ہیں جو اخوان کے لیے کسی جذبہ مہمدرستی بالکل خالی ہو کر مصری آمریت کے اس کارنامے کے لیے جواز کے دلائل پیش کرتے پھرتے ہیں۔ انکفا اتنے ہی پر نہیں اپنے اپنے قصہ صحافت کی منڈیروں پر گھی کے چراغ جلا جلا کر اس طرح خوشی منار ہے ہیں کہ جیسے عمروں ترسنے کے بعد پہلی مرتبہ ان کے دلی ارمان پورے ہوئے ہوں۔ یہ پورے زور قلم سے مصری آمریت کو داد دے رہے ہیں کہ یہ تھا کرنے کا اصل کام جو تم نے جرات مندی سے کر ڈالا۔ اور پھر اپنے حکمرانوں کے سامنے اسے اسوہ حسنہ بنانا کے رکھ رہے ہیں کہ حضور! اسلام اور جمہوریت اور ملک اور عوام کی سب سے اونچی خدمات انجام دینے کے تو یہ ڈھنگ ہیں۔ یہ پوزیشن ابھی تک صرف ملت، انفضال اور رسول اینڈ ملٹری گزٹ جیسے جرائد کی طرف سے ہمارے سامنے آئی تھی۔ ان جرائد کی پالیسی کے متعلق چونکہ ہماری ایک مستقل رائے ہے کہ وہ ایسے مذہبی فتنوں کو اپنے پس منظر میں رکھتے ہیں جو کبھی آدمی کو عالی ظرفی سے مالا مال ہونے کا موقع نہیں دیتے اس لیے ان کا اپنے جذبات کو بوجھال نہ سکتا کچھ عجیب نہیں لگا۔ مگر آپ کا یہ ادارہ پڑھ کر ہمارے اس حسن ظن کو کچھ نہ کچھ ٹھیس ضرور لگی ہے جو پریس کے روبرو پستی کی طرف لڑھکنے کے باوجود ممتاز اخبارات کے بارے میں کسی نہ کسی حد تک قائم ہے۔

اب آپ اپنے ادارے کا ایک بار خود ناقدانہ جائزہ لے کر دیکھیے۔ آپ پر ایہ آغاز میں "اخوان المسلمون" اور ان کے مرشد عام کا دردناک حشر کے الفاظ سے بات شروع کرتے ہیں اور اس کو "دکھ اور کرب کا معاملہ" قرار دیتے ہیں لیکن کل ۲۶ الفاظ میں یہ سارا دکھ اور کرب پیش کر کے ساڑھے پانچ سطروں کے بعد آپ ایک "مگر" (BUT) استعمال کرتے ہیں جس کی سرحد سے آگے پورے کا پورا میدان بحث اخوان کے خلاف جمال ناصر اور اس کے اقدام کی حمایت کے لیے وقف ہو گیا ہے۔ اس "مگر" کے بعد کہیں ایک رتی بھر "دکھ اور کرب" محسوس نہیں ہوتا، بلکہ اٹا اٹھا اطمینان کی ہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس "دکھ اور کرب" کی داستان کو آپ جہازی صفحے کے چار لیے لیے کالموں میں لکھ گئے مگر عدل و انصاف کے اسلامی یا جمہوری اصولوں کی روشنی میں امری اقدامات کا سرے سے

اپنے ہاتھ نہیں لیا۔ اس معاملے میں آپ نے دلیل کی بجائے تمام تر انحصار و عہد ان پر کیا ہے۔ بس یہ واقعات چونکہ آپ کو لپیڈ لگائے ہیں، لہذا وہ جس بھی اسلوب سے کر ڈالے گئے ہوں میں حق اور سبہ صواب ہیں۔ پورا مصنف پڑھ جائے بعد خود بخود یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آخر آپ کے ان تہمدی ۲۶ الفاظ کا اس تحریر میں مصروف کیا ہے۔

ایک ہی فریق۔ اور غالب فریق، جس نے دوسرے فریق کا منتر بھی بند کر رکھا ہو۔ کے دعویٰ کو من و عن لے کر اُس پر رائے قائم کرنا اور پھر اپنے ادارے میں اسی طرفہ رائے سے پاکستان کے لیے ایک ”درس عبرت“ پیدا کرنا خواہ مخواہ اس نتیجے تک پہنچا تا ہے کہ فاضل مدیر پہلے سے یہ درس عبرت اپنے ذہن میں رکھتے تھے اور مصر کی تاریخ امروز کو انہوں نے اپنے رجحانات کے سانچے میں ڈھال کر ایک شے معمود کے لیے استعمال کر ڈالا ہے۔ چنانچہ سارے کا سارا ادارہ بول کر کہہ رہا ہے کہ خود پاکستان میں ایسی دو طاقتیں ان کے سامنے ہیں جن میں سے ایک کو وہ انہوں نے جگہ دکھنے ہیں، دوسری کو ناصری آمریت کی جگہ اور پھر نیرجانب دار ممبرین کر نہیں، بلکہ مؤخر الذکر طاقت کے دلیل بن کر کلام فرماتے ہیں :-

معادہ سوزیز | بہر حال انہوں نے انصاف کے اختلاف کا تجزیہ کرنے کے لیے سلمیٰ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک آڈ کی حیثیت میں انہوں نے معادہ سوزیز کے اختلاف کو استعمال کیا ہے۔ افسوس ہے کہ سلمیٰ صاحب کو اس سلسلے میں پوری صورتِ حالات کا علم نہ ہو سکا۔ واقعات یوں ہیں کہ معادہ کا سوال جب اٹھایا گیا تو اس وقت مصری موقف یہ تھا کہ پہلے علاقہ سوزیز کو برطانیہ اپنی فوجوں سے خالی کر دے، پھر معادہ ہو سکے گا۔ لیکن برطانیہ جیسی گھاگ طاقت محض بیانیوں اور درخواستوں سے تو اپنی روش نہیں بدل لیتی، وہ تو صرف طاقت کو مانتی ہے۔ مصر کے جتنا راج نے ضرورت محسوس کی کہ برطانوی فوجوں کے لیے مصر میں ٹیکنائمن بنا دیا جائے۔ یہ ہم انہوں کے سپرد ہوئی کہ وہ گویا وار کا سلسلہ شروع کر دیں۔ چنانچہ برطانیہ نے اس وقت معادہ کرنے کے لیے اپنی اگڑی ہوئی گردن کچھ نیچے کو جھکا لی ہے جب انہوں نے علاقہ سوزیز میں اس کے فوجیوں کا ناک میں دم کر دیا ہے۔ آخر جن لوگوں نے انگریز کو معادہ تک لانے کے لیے اپنا خون رگ جلا پیش کیا تھا اس معاملہ میں ان کی دلچسپیوں کا گمراہونا بالکل قدرتی امر تھا۔ انہوں کی یہی گری دلچسپی تھی جس کی وجہ سے خود برطانوی نمائندے نے محض ناصر سے گفت و شنید کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انہوں نے کمرشدرعام سے بھی براہِ راست گفتگو کر لینا ضروری سمجھا اور اس بارے میں خود ناصر سے بات بھی کر لی۔ مصر کی وہ

مقبول عام منظم طاقت جس نے برطانوی فوجی طاقت کے لیے ان چین کا سانس لینا حرام کر رکھا تھا، برطانیہ اس کے بارے میں مطمئن ہوئے بغیر کس طرح ایک کاغذی معاہدے پر انحصار کر سکتا تھا۔ شیخ حسن اہمضیبی سے ایوز نے ملاقات کی درخواست کی۔ شیخ موصوف نے اس کی اطلاع فوراً کرنل ناصر کو دی۔ کرنل ناصر کے علم میں لاکر یہ ملاقات کی گئی۔ ملاقات کے بعد شیخ موصوف نے پوری رپورٹ بھی ناصر کو پہنچا دی۔ شیخ حسن اہمضیبی یا اخوان کے نقطہ نظر کے معاہدہ کی مجوزہ شکل تمام تر برطانیہ کے مفاد میں جاری تھی۔ برطانیہ کو جو مقصد کروڑوں پونڈ کے سالانہ خرچ سے علاقہ سوئز میں فوج رکھ کر حاصل تھا اب اس معاہدہ میں مصر کو باندھ لینے کے بعد لیسر اس خرچ کے حاصل رہے گا یعنی ترکیہ اسرائیل یا کسی دوسری حلیف عرب ریاست کے لیے خطرہ پیدا ہو جانے کی صورت میں برطانیہ اپنی بین الاقوامی ضروریات کے تحت مصر میں جب چاہے فوج اتار سکتا ہے اور حکومت مصر اس میں مزاحم نہیں ہو سکتی۔ اتوانی نقطہ نظر یہ تھا کہ آئندہ جنگ کی صورت میں ہم برطانیہ سے ایک آزاد ریاست ہونے کی حیثیت میں تعاون کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد حاصل کر سکتے ہیں، لیکن اپنی آزادی اور سادومنی کو مستقل طور سے گرو نہیں رکھ سکتے۔ اتوان نے آخری درجے میں یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ اس معاہدہ کی حتمی توثیق اس وقت تک عمل میں نہ لائی جائے، جب تک مصر کی ایک منتخب پارلیمنٹ اسے منظور نہ کر دے، اس سے قبل مصری عوام اور پریس کو اس معاہدے پر آزادانہ تبصرے کا حق حاصل رہنا چاہیے۔

مصر کی رائے عام، باوجود اظہار پرہیزار بندشیں ہونے کے صریحاً اسی اتوانی موقف کے حق میں تھی چنانچہ بعد میں جب ناصر اور ایوز کا گٹھ جوڑ ہو گیا تو فوج اور سول سروس کے حلقوں سے بے شمار تہمتی اور محب وطن اتھامس کو نکال باہر کرنا پڑا۔ یونیورسٹی کے حلقے سے چالیس پروفیسروں نے اس گٹھ جوڑ کے خلاف اظہار رائے کیا اور وہ سب کے سب نکال دئے گئے۔ بہر حال جب ایوز اور ناصر اتوان کے بارے میں ناامید ہو گئے تو دونوں کے نزدیک یہ ناگزیر ٹھہرا کہ معاہدہ کرنے اور اسے کامیاب بنانے کے لیے مصر کی اس خیر خواہ طاقت کا قلع قمع کرنا ضروری ہے جس کی قربانیوں نے ناصر کے ہاتھ مضبوط کیے تھے اور اسے انگریزوں کو معاہدہ ننگ کھینچ لانے کے قابل بنایا تھا۔ جن لوگوں کے خون سے اس معاہدہ کے حروف لکھے گئے ہیں، آپ کس مزے سے ان کے بارے میں صحافت کی آرام گری پر بیٹھ کر یہ تبصرہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ معاہدہ کو آڑ بنا کر استعمال کر رہے ہیں۔

اخوان کے موقف پر فوجی آمریت کی جانب سے جرح کرتے ہوئے سلمری صاحب نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے

کہ کیا آدم کا کوئی ایسا بیٹا ہو سکتا ہے جو غیر کے سامنے جھکنے پر تیار ہو جائے؟ اس جرح کے جواب میں سب سے پہلے تو ہم یہ پوچھیں گے کہ کیا آپ نے اُس وقت بھی یہ سوال اٹھایا تھا جب مسلم لیگی حلقے تہجد جہد پاکستان میں مولانا حسین احمد، مولانا ابوالکلام آزاد، جمعیت العلماء ہند اور دوسرے کانگریسی کارکنوں کے بارے میں ہر ہر سانس بیکتے تھے کہ یہ سب ہندوؤں کے ہاتھ بک گئے ہیں؟ کیا یہ سوال آپ نے اس وقت بھی اٹھایا تھا جب شیخ عبداللہ کشمیری لیڈر کے بارے میں بچہ بچہ یہ کہہ رہا تھا کہ اس نے مسلمان قوم کے مفاد کے خلاف نہرو اور پٹیل سے ساز باز کر لی ہے؟ دوسرے ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ بھاری مسلم سلطنت کی اسی بڑھیم کی تاریخ میں جعفر اور صادق کی طرح کے جو لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں، وہ کیا انسانی لطفے سے پیدا نہیں ہوئے تھے؟ اس کے بعد ہم اس مسئلے میں روشنی حاصل کرنے کے محتاج ہیں کہ کیا دنیا کی ڈپلومیٹک تاریخ میں ایسے سو دوں کی مثالیں بکثرت موجود نہیں ہیں جن میں مختلف سلطنتوں کے فرماں رواؤں نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے بڑے بڑے فوجی مفاد کو داؤں میں لگا دیا ہو، یا کم از کم اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے کسی مالی امداد کے حاصل کرنے یا کسی فوجی مسئلے سے بچنے یا کسی قوم کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اپنی منافع آزادی و حاکمیت کو ہاتھ سے دے دیا ہو۔ کیا خود اسی تہر سو بڑی پچھلی تاریخ اس بات کی شہادت فراہم نہیں کرتی کہ آدم کے ایسے بیٹے گذرے ہیں جنہوں نے اپنے ملک کے مفاد کے خلاف دوسری قوموں سے معاہدے کیے ہیں؟ سلہری صاحب جیسے اخبار نویس کو اس سے ناواقف نہیں ہونا چاہیے کہ مغربی اقوام نے ایشیائی اور مسلم ممالک کو تلوار کے زور سے کبھی محض نہیں کیا، ہمیشہ ایسے معاہدوں کے جالوں میں پھانسا ہے جن میں ادنیٰ درجے کے فائدوں کے عوض وسیع پیمانے پر اپنے لیے مفاد حاصل کئے ہیں۔ یہ بالکل الگ بات ہے کہ کہاں بددیانتی نے کام کیا، کہاں حماقت نے اپنا کرشمہ دکھایا اور کہاں محض کمزوری نے گل کھلائے، سلہری صاحب دنیا کی ڈپلومیٹک تاریخ کے سہاروں صفحات پر پھیلی ہوئی بددیانتی، غداری اور حماقت کی درونماک داستانوں پر اپنے ایک سوالیہ جملے سے خطِ تلخ کھینچ دینا چاہتے ہیں۔

چلیے، ہم بغیر کسی بحث کے مان لیتے ہیں کہ معاہدہ سویر اپنی موجودہ شکل میں بہترین ہے، عوام کے مفاد سے اترتے

تہ ابھی چند ہی روز پہلے ناصری آمریت نے علی الاعلان اعلانِ خون پر یہ بے تگہ الزام لگایا تھا کہ وہ انگریزوں سے ساز باز کر رہے ہیں، اور پھر حالیہ استبدادی ہم کے دوران میں ایک سازش پکڑنے کی خبر دیتے ہوئے اُس سے زیادہ نامعقول الزام یہ لگایا گیا کہ خونِ بیڑوں گٹھ جوڑ کیے ہوئے تھے۔ کیا لہری صاحب نے ان الزامات کے جواب میں اتواروں کی مدافعت کے لیے بھی ایسا کوئی سوال اٹھایا ہے؟ آخر وہ بھی تو آدمی کے بیٹے ہیں۔

اور انہوں نے اسے محض ایک آڈینا کر حصولِ اقتدار کی جدوجہد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے مفید فوہم معاملات کو طے کرنے کے لیے آمرانہ منہاندی کی ہولناکی نفاذ پیدا کرنے اور اسے عام کا گلا گھونٹ رکھنے کی ضرورت کی تھی؟ کیوں نہ ایسے اہم اور پوری قوم کے نفع و نقصان سے تعلق رکھنے والے مسئلے کو ایک کھل جہوری فضا میں قوم کے سامنے رکھا گیا؟ کیوں نہ لوگوں کو اس پر اظہارِ رائے کے پورے پورے مواقع دئے گئے؟ کیوں اسے ایک ایسی فوجی ڈکٹیٹر شپ کے ذریعے قطعیت سے طے کر دیا گیا جو محض ایک عارضی حیثیت سے دستوری زندگی کو معطل کر کے کام چلا رہی ہے اور جس کا کام صرف جمہوریت کے لیے راستہ صاف کر کے واپس اپنی بارکوں میں مٹ جانا ہے؟ قوموں اور ملکوں کی قسمت کا سہا لہال کے لیے ایک یا چند افراد کا اس طرح کی عذائی حیثیت اختیار کر کے فیصلہ کر ڈالنا، ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ کدھر سے معقول ہے۔ اس بارے میں ہم سہری صاحب کی رہنمائی کے بہت ہی محتاج ہیں۔

سہری صاحب کا معاہدہ کی موجودہ شکل کے حق میں استدلال یہ ہے کہ چونکہ غیر جانبداری ممکن نہیں رہی اور داخلی استحکام اور صنعتی ترقی کے لیے بڑی بڑی مغربی طاقتوں کی امداد حاصل کرنا بالکل ناگزیر (BADLY NEEDED) ہے لہذا مصری آمریت نے اس عبورانہ پوزیشن سے ممکن حد تک بہترین نتیجہ پیدا کر لیا ہے۔ اور پیش نظر معاہدہ نے مصر کے بین الاقوامی اثر و رسوخ کو بہت بڑھا دیا ہے۔

اس استدلال کے مقدمات سے کسی نہ کسی حد تک ہمیں بھی اتفاق ہے۔ مثلاً یہ بات کہ آئندہ جنگ کے لیے جو دو دھڑے پیدا ہو گئے ہیں، ان میں سے ایک کی گمان کیوزم کے ہاتھ میں ہے اور دوسرے کی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے ہاتھ میں۔ ان دونوں میں جب بھی انتخاب کا سوال پیدا ہوتا ہے تو بہت سے عوامل ایسے ہیں کہ جن کے تحت ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے مسلمان ممالک کا رجحان کیوزم کے مخالف دھڑے ہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ غیر جانبدارانہ پوزیشن قائم رکھنے کا امکان اگرچہ موجود ہے، لیکن عملاً یہ صورت مشکل سے نبھائی جاسکتی ہے، لیکن سہری صاحب کا ذہن جس طبقے کی وکالت کر رہا ہے اس کا نکالا ہوا یہ نتیجہ کہ اگر غیر جانبداری ممکن نہ ہو اور کسی ایک کے ساتھ لگتا ضروری ہو تو پھر سیدھے چھل کر اس کے گھڑے کی چھیل بن جانا چاہیے اور اس کے بعد اظہارِ اطمینان کرنا چاہیے کہ بس یہی بہترین صورت تھی جسے ہم نے اختیار کر لیا ہے۔ جس کے ساتھ لگوا، پوری طرح امداد و مدد دینا کہہ کر آزادی، ماخوذ داری، استقلال اور اہمیت وغیرہ جیسی چیزوں کو اس کے قدموں میں ڈال دو۔

ڈپلومیٹک تاریخ ہزاروں مثالوں سے گواہی دیتی ہے کہ بڑی اور سربراہ کا رطاقوں کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ وہ چھوٹی قوموں سے من مانے شرائط پر معاملات طے کریں۔ دوسری طرف چھوٹی قومیں پوری پوری تدبیریں اختیار کرتی ہیں کہ وہ کسی طرح اپنی آزادی اور حاکمیت اور اپنے اہم مفاد کو بچا کر چھوٹے کریں۔ چنانچہ آج بھی امریکہ و برطانیہ اس امر کے درپے ہیں کہ وہ کچھ ڈالر یا فوجی اسلحہ یا محدود سامان الا توامی تعاون قیمت میں دے کر چھوٹی چھوٹی نوخیز یا مخصوص مسلمان قوموں کے اوپر بھرپور ہاتھ ماریں۔ ایسی صورت پیش آجانے پر اگر کسی نوخیز قوم کو منصف اور بیدار مغز اور حقیقی دلوں کا رکھنے والے حکمران نصیب ہو جاتے ہیں تو وہ ڈپلومیٹک دائرے میں اپنی مضبوط پالیسی کے ذریعے دور رس منصوبہ بنا کر لمبی کشمکش کرتے ہیں۔ وہ ایک طرف قومی بقا اور تعمیر و ترقی کا اصل دار و مدار اپنے عوام کی بیداری، تنظیم اور حرکت پر رکھتے ہیں، دوسری طرف اپنی ضروریات و مشکلات کے بارے میں کسی طرح کا اضطراب اور ان کو حل کرنے کی فکر میں لگی نہیں ملکی امداد کے لیے بے چینی دکھائے بغیر فوصلہ کن طاقت اپنی رائے عام کو قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ گاندھی جی کے بارے میں مشہور ہے کہ جب کبھی برطانوی حکومت کے نمائندوں سے گفتگو ہوتی تو گاندھی جی یہ کہا کرتے تھے کہ میں کیا کر سکتا ہوں فیصلہ تو کانگریس کے ہاتھ میں ہے، یا کہتے کہ میں تو مان جاؤں لیکن جتنا نہیں مانتی۔ گاندھی جی کی مثال تو دور کی ہے ہمارے اپنے ہاں قائد اعظم کی سیاسی بصیرت نے ہی روایت زیادہ شاندار طریق سے قائم کی ہے۔ موصوف نے جب کبھی برطانوی وائسرائے یا کسی مشن سے گفت و شنید کی ہے تو ہمیشہ یہ بات کہی ہے کہ یہ اور یہ کچھ تو میری قوم کا مطالبہ ہے میں اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتا یا یہ کہ فیصلہ مسلم لیگ کی کونسل کے ہاتھ میں ہے، میرا کیا اختیار! یہ محض ایک تھکانڈہ نہیں ہوتا، درحقیقت ایک لیڈر یا حکمران ضمنی اہمیت عوام کو دیتا ہے اور ضمنی ساکھ اپنی قوم کی بنانا ہے خود اس کی اپنی اہمیت اور ساکھ ہی پیمانے پر بنتی ہے۔ ان طریقوں سے لیڈر اور حکمران ڈپلومیٹک دائروں میں معاملات طے کرنے کے لیے اپنی قوتِ معاملہ گری (BARGAINING POWER) کو بڑھاتے ہیں۔

بخلاف اس کے جب باگ ڈور کسی نادان فیادت کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے تو وہ اپنی ضروریات اور مشکلات کا لئے ہی پالیسی کی نہ کسی حد تک ہمارے ملک کے اندر مرحوم لیاقت علی خاں کے عہد تک برقرار رہی۔ اسی پالیسی نے ابتدائی چند سالوں میں پاکستان کی ساکھ اور اہمیت پیدا کی۔ لیاقت علی خاں کے بعد سے اکابر نے اپنی پالیسی کو کمزور کرنا شروع کیا۔ اور اب جہاں نسبت پہنچ گئی ہے۔ واضح ہے۔ لیاقت مرحوم خود بھی امریکہ سے امداد حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے مگر بغیر اپنے ملک کو گرائے اور بغیر جلد بازی سے کام لیے۔

یوں ہر عام روئے لگتی ہے، وہ چوراہوں پر کھڑی ہو کر واویلا کرتی ہے کہ اگر ہمیں فلاں ملک سے امداد نہ ملی اور فلاں سے
 جلد از جلد بھجوتہ نہ ہو سکا تو ہم ختم ہو جائیں گے۔ وہ اپنے عوام کو تقریروں اور اخباری تحریروں کے ذریعے لگی پٹی
 رکھے بغیر یہ یقین دلانا چاہتی ہے کہ اگر فلاں کا دہن تھامتے سے تم نے ہیں رو کا تو پھر تم کہیں کے نہ رہو گے، بلکہ وہ خود
 بڑی طاقتوں کے سامنے جا کر اپنا سارا بھرم کھول دیتی ہیں کہ ہم تو اب ایک دن بھی آپ کے سائے شفقت کے بغیر
 زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس پر جب وہ طاقتیں ان سے یہ دریافت کرتی ہیں کہ آپ اپنے عوام کو کسی صورت معاملہ پر کس طرح
 راضی کر سکیں گے تو وہ پہلے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ ہمارے عوام احمق، جاہل، بدعوا اور غیر موثر طاقت ہیں۔
 اصل چیز ہم ہی ہم ہیں، جو کچھ ہم کر دیں گے اس سے کوئی عمومی اختلاف نہیں ہوگا۔ چند آوازیں اٹھیں گی بھی تو از خود ٹھنڈی
 پڑھائیں گی۔ لیکن دنیا کی بڑی بڑی کاٹیاں طاقتیں حالات کو اتنی سرسری نگاہ سے تو نہیں دیکھتیں، وہ ایسی قیادتوں سے
 زیادہ وضاحت کے ساتھ جانتی ہیں کہ کسی ملک میں عوام کے اندر کیا کیا رجحانات پائے جاتے ہیں اور کس کا کتنا زور ہے۔
 چنانچہ وہ پھر نام لے لے کر پوچھتی ہیں کہ فلاں فلاں کو کس طرح ساتھ لے سکیں گے؟ اس پر بھولی بھالی نیادیں اپنے
 مضبوط اقتدار کا حوالہ دے کر ان کو اطمینان دلاتی ہیں کہ ان طاقتوں کو تو ہم کھپ کے رکھ دیں گے۔ یہاں پہنچ کر ان کی
 قوتِ معاملہ گری آخری لفظ پر آگتی ہے۔ پھر ان سے منوائے والے جو کچھ چاہتے ہیں، منوائے میں۔ مینز کی لڑائی میکر
 بہ جاتی ہے۔ جو لوگ اپنوں کو کھپ کر غیروں سے معاہدے باندھتے ہیں وہ ملکی مفاد کی تباہی کا سبب بن جاتے ہیں۔
 یہی صورت معاہدہ سوئیز میں پیش آئی۔ بیرونی امداد کا حصول صنعتی تعمیر و داخل استحکام اور بین الاقوامی اثر و رسوخ
 بڑھانے کے لیے قطعاً ناگزیر بھڑا۔ غیر جانب داری ناممکن محسوس ہوئی لہذا جانب داری کی ہر سبت سے سبت صورت کو
 جلد از جلد اختیار کرنا طے پایا۔ مطالبہ ہوا کہ انگریزوں سے معاہدہ کرنا ہوگا، یہ معاہدہ ہو گیا۔ تقاضا ہوا کہ اسرائیل سے تعلقات
 درست کرنے ہوں گے اور ان کے جہازوں کے لیے سوئیز کو کھول دینا ہوگا، تعلقات درست ہو گئے اور آج یہودیوں کے
 سامان سے بھرے ہوئے جہاز سوئیز کی موجوں پر سے گزر رہے ہیں۔ چاہا گیا کہ اخوان کارورڈا دوستانہ تعلقات کے راستے سے
 ٹہا دیا جائے، چنانچہ فوجی عدالتیں قائم ہو گئیں اور اخوان کے لیے پھانسیاں گاڑ دی گئیں۔ سلہری صاحب جس ذہنی کیفیت میں
 مبتلا ہیں ان میں رہتے ہوئے وہ مشکل ہی سے انمازہ کر سکتے ہیں کہ ناصری آمریت نے کتنا کم کہا اور کتنا زیادہ کھو دیا ہے۔
 ایک طرف بالکل کنا سے بلیجھ کر انگریزوں نے اخوان سے انتقام لے لیا، دوسری طرف اخوان جیسی منظم طاقت سے خود

ناصر کو محرم کر دیا جس کے تعاون سے وہ معاہدہ طے کرنے کے قابل ہوا تھا۔ تیسری طرف مصر کے عوام کے اعتماد کی زمین امریت کے قدموں تلے سنے نکلوا دی، چوتھی طرف مسلمان ممالک کی وحدت کو سخت دھکا لگوا دیا، پانچویں طرف احیائے اسلام کی ایک ایسی قابل قدر تحریک کو کمزور کر دیا جس کا اثر پورے عالم اسلام میں پھیلا ہوا تھا اور جس کی دعوت مسلمانوں میں زندگی کا نیا ولولہ پیدا کرنے کا موثر ذریعہ تھی۔ اب ناصری امریت کو اس درجہ کمزور کر لینے کے بعد آئندہ جو معاملات ہوں گے، آپ جیسا اخبار نویس کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور کر سکتا ہے کہ ان میں مصر کا بیڑہ اور کتنا ہلکا ہو جائے گا۔

سہری صاحب بتائیں کہ جو لوگ ڈپلومیٹک میدان میں اپنی قوموں کے نادان دوست بن کر یہ بودی پالیسی اختیار کیے ہوئے ہوں اور جو ڈھنڈورہ پیٹیں کہ لوگوں کو ہم بغیر جانبدار نہیں رہ سکتے۔ ہم اپنے بل بوتے پر تعمیر و ترقی کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ ہم بغیر غیر ملکی امداد کے ایک دن بھی نہیں سکتے اور پھر جو اپنے عوام کو مکملی اور ٹھہر کے برابر وقت نہ دیں بلکہ ان کی جہالت اور ان کے بھروسے کے نابل ہونے کا استہوار دیتے ہوں، اور بڑی طاقتوں کو تسلی دلاتے ہوں کہ ہمارے فیصلوں کے خلاف جو سرتابی کرے گا اسے ہم نابود کر کے رکھ دیں گے، ان کے ہاتھوں کوئی معاہدہ بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ جس میں نفع کمانا تو الگ رہا، معاملہ برابر برابر کا طے ہو جائے؟ کیا ان کے بارے میں یہ فارمولہ پیش نظر رکھنا کافی ہے کہ "آدم کا کوئی بیٹا کسی غیر کے آگے جھکنے پر تیار نہیں ہو سکتا؟" سمجھ دار حکمران اور لیڈر ہمیشہ اس بات کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ میں الاوقامی سمجھوتوں کے لیے جب بھی بات چیت ہو، بلکہ بات طے ہو جانے کے بعد بھی عوامی دائرے میں کوئی نہ کوئی عناصر ایسے موجود رہیں جو معاہدوں کے کمزور پہلوؤں پر اضطراب دکھائیں اور ان پر نافدانہ نظر ڈالتے رہیں تاکہ ان کے ہونے سے اپنی قوت معاملہ گری کو مضبوط تر رکھا جاسکے، نیز بعد میں بھی اپنی قومی خودداری میں کمی نہ ہونے دی جائے اور زیادہ بہتر نتائج حاصل کیے جاسکیں۔ اب جن لوگوں کو نہ بات چیت کے دوران میں کسی کا اختلاف گوارا ہو، نہ بات طے کر لینے کے بعد تنقید کے لیے قوت برداشت رکھتے ہوں وہ مجال ناصر سے زیادہ شاندار کارنامے کیسے انجام دے سکیں؟

بیرونی امداد انڈیا کے حکمرانوں نے بھی حاصل کی ہے لیکن اپنی آزادی، حاکمیت، بڑے بڑے مفاد، اور قومی خودداری کا پر بھی آئینچ نہیں آنے دی۔ یہاں وجہ سے کہ انہوں نے عوام کو اعتماد میں لے لیا، رائے عام کو زندہ رہ کر حالات پر اثر انداز ہونے کا موقع دیا، قوم کو معاملات کے بارے میں بہر سٹیج پر آگاہ کیا، اختلافی نقطہ ہائے نظر رکھنے والوں کو تنقید کا اذن دیا۔ کیا امریکی امداد لینے کے لیے نہرو گورنمنٹ نے بھی کسی دوسرے ملک سے سمجھوتہ کرنا اپنے اوپر لازم ٹھہرایا؟

کیا کسی جماعت اور تنظیم کو مخیر برائ ہاتھ میں لے کر ملیا میٹ کرنے کا کوئی کارنامہ سرا انجام دیا؟ کیا اپنے دروازے سے دوسرے کو چوٹ کھول دے کہ آویہ چڑا گاہ غمار سے لیے بالکل کھل ہے؟

پالیسی کا ایک راستہ یہ تھا، لیکن انوس کہ ہمارے ممالک کی نیاد میں اور حکومتیں اس کے بجائے دوسرے راستے پر چل نکلی ہیں، یعنی چونکہ غیر جانبداری ممکن نہیں ہے اور تعمیر و استحکام کے لیے کسی طرف سے مدد کا حصول بالکل ناگزیر ہے لہذا سب کچھ دے کر جلد سے جلد معاملہ طے کر لینا چاہیے۔ اس بودی پالیسی پر اخوان جیسے خیر خواہان ملک و ملت اگر کڑھے ہوں اور ان کا درد دل اظہار اختلاف پر عبور ہو گیا ہو تو یہ کوئی ایسی بات تھی کہ آمریت تدارکے کر پل پڑتی! بس یہ کافی تھا کہ وہ عوام کو معاہدہ کے بہترین ہونے کا یقین دلا دیتی اور اخوان کا اختلاف اجتماعی فیصلے کی روکے آگے چار دن بھی نہ ٹھہر سکتا۔ اخوان کو رائے عام کے زور سے شکست دینے کے بجائے استبداد کا نشانہ بنانا اس امر کی دلیل فراہم کرنا ہے کہ رائے عام آمریت کے حق میں نہیں تھی اور جمال ناصر اس بات سے بھی مایوس تھے کہ وہ مزید کوشش کے بعد دلیل کی قوت سے قوم کو ساتھ لے سکتے ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی اگر اتنی کم سے کم حکمت و بصیرت انقلابی کونسل میں موجود ہوتی جتنی کسی ملک کا کارپرداز بننے کے لیے ضروری ہوتی ہے تو جمال ناصر ایک طرف مغربی طاقتوں سے تقاضا کرتے کہ میری قوم اس حد تک جانے پر تیار نہیں ہے، آپ کو موجودہ شرائط سے نیچے ہٹنا پڑے گا، اور دوسری طرف خود قوم کو یہ تسلی دلا کر کہ ہو گا وہی کچھ جس پر نوازشی ہوگی، مزید افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری رکھتے اور عوامی رجحانات کے ساتھ زیادہ سے زیادہ سازگاری پیدا کرتے۔ اس طرح آمریت کی قوت معاملہ گری میں بھی اضافہ ہوتا اور معاہدہ کے لیے داخل فضا بھی بغیر خون خرابے کے تیار ہوجاتی۔ لیکن وہاں تو جلد ہی تھی اور ذہن قومی مفاد کے فیصلے کرنے کی اجارہ داری کے نشے میں تھا۔ جیسے جمال ناصر کو اپنی کسی ذاتی جاگیر کا کوئی معاملہ طے کرنا تھا اور وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ جی ہاں، وقت اس معنی میں ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا کہ آمریت کے ناپائیدار تخت کے پائے رائے عام کے عدم اطمینان کی وجہ سے منتشر اور ہورہے تھے۔ کیا معلوم کس لئے کیا ہو جائے!

سہری صاحب کی بصیرت کی روشنی ہم پر یہ واضح کرتی ہے کہ اس معاہدہ سے مہر کا بین الاقوامی اثر و رسوخ بڑھ گیا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دوسروں کے جس درجے کے مطالبے مان کر یہ اثر و رسوخ حاصل کیا گیا ہے، اس کے ذریعے اب مصر اپنے اور اسلامی دنیا کے کتنے ایک پیچیدہ مسائل کو بین الاقوامی طاقتوں کے تعاون سے حل کر لیتا ہے

یہودی ریاست کا مسئلہ ہے، ٹیونس، المغرب اور الجبیر یا کا مسئلہ ہے، پاکستان کے سامنے کشمیر اور نہری پانی کا مسئلہ ہے اب یہ سب متصر کے بین الاقوامی اثر و رسوخ سے حل ہو جائیں گے۔ پوزیشن ٹھیک وہی ہے جیسے غلام ہندوستان میں گورنر کے کسی دربار میں جب ایک ہندوستانی جمعدار یا کسی جاگیردار کو اپنی خدمات کے عوض کرسی مل جاتی تھی تو اس کے خاندان اور علاقے کے لوگ محسوس کرتے تھے کہ اس کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن یہ اثر و رسوخ کبھی ان قومی وطنی مسائل کے کام نہ آسکا جن سے عوام دوچار رہتے تھے، اس طرز کا اثر و رسوخ خود سامراج ہی کے کام آتا رہا۔ مصر نے ٹھیک اسی قسم کا بین الاقوامی اثر و رسوخ حاصل کیا ہے۔ وہ اپنا سر اقتدار اس خیال سے بلند کر سکتا ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کی سرپرستی مجھے حاصل ہے، لیکن اس خیال کے غبارے سے اس دن ساری ہوا نکل جائے گی جس دن مصر نے کوئی ایسا مسئلہ چھیڑا جو ان سرپرستوں کے مفاد کے خلاف پڑنے والا ہو۔

دوسرے وجوہ اختلاف | سلمیٰ صاحب نے تنہا معاہدہ سوئز کو ظاہری وجہ اختلاف کی حیثیت سے پیش کیا ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ دوسرے وجوہ کا ان کو سرے سے علم نہیں تھا، یا علم ہوتے ہوئے انہوں نے ان سے صرف نظر کر لیا ہے، بہر حال اس ادارے میں کوئی دوسری چیز مذکور نہیں ہے۔ لیکن یہ بات ایک معمولی اخبار میں آدمی سے بھی مخفی نہیں کہ دو اور بڑے اختلافات کارفرما تھے۔ ان میں سے ایک اس مطالبے پر تھا کہ جو انقلاب اسلام کے نام پر اٹھایا گیا ہے اور جس میں ایک اسلامی تحریک نے بڑا پارٹ ادا کیا ہے اس سے عوام بجا طور پر یہ امیدیں لگائے بیٹھے ہیں کہ اسلامی نظام زندگی کی طرف کسی ملکی سے ملکی تدریج سے سہمی۔ عملی قدم اٹھنے چاہئیں۔ لیکن آمریت نے نہ صرف یہ کہ اس مطالبے کو نظر انداز کیا ہے، بلکہ عملی قدم اس کی مخالف سمت میں اٹھائے ہیں۔ اسلامی معاشرت کی سچی ترقی قدر کو تلبٹ کرنے کے لیے آرٹ کے مذہب نام پر نایچ گانے کی مجلسیں منعقد کرنے اور بے حیائی و بے پردگی کی دبا کو پھیلانے، خصوصاً غیر ملکی لوگوں کے لیے مرشدات (گائیڈ) کا کام کرنے والی بے باک (ڑکیاں) فراہم کرنے کا جو نیا طوفان اٹھایا گیا اس کی طرف انہوں نے ناہر کو بار بار متوجہ کیا کہ یہ ان وعدوں سے انحراف ہے جن کے ساتھ انقلاب اٹھایا گیا تھا۔ اس پر مزاج یار برہم ہوا اور ہوتا چلا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ سلمیٰ صاحب اس معاملے میں انہوں کو مذہبی رنگ نظر کا الزام دے کر آرٹ کے ان مظاہروں کو ضروری چیز قرار دیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ جس چیز کو اسلام اور اسلامی نظام۔ ہمارے نقطہ نظر سے نہ سہی خود آپ حضرات کے نقطہ نظر سے۔ کہاجاتا ہو، اس کی طرف ناصری آمریت کا کوئی ایکنگ

اس پر سے عرصہ میں اٹھا ہوا دکھا دیجیے کہ یہ اسلامی کارنامہ عجیب موجود تھا تو انہوں نے جلد بازی اور انتہا پسندی سے کیوں کام لیا؟

دوسرا بڑا اختلاف جمہوریت کی بحالی کے مطالبے پر واضح ہوا ہے۔ مصری پبلک اور انہوں نے ہنگامی حالات اور فوجی آمریت کو ایک مختصر ترین عرصے کے لیے اس اعلان پر قبول کیا تھا کہ فوج صرف خیانت (CORRUPTION) کا قلع قمع کرنے کے لیے اقتدار کے ایوان میں رُک گئی ہے، ورنہ سیاسی کارفرمائی کا بکھیرا فوج کے بس کا روگ نہیں، ہم لوگ تو سپاہی ہیں، جلد سے جلد اپنی بیروں کی طرف لوٹ جائیں گے۔ لیکن جو لوگ آمریت کے منصوبے لے کر اٹھتے ہیں ان کا راستہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ وہ ہنگامی حالات کے اعلان کے سائے میں کسی نہ کسی طرح تخت بچھا لیتے ہیں، پھر اس کے پائے مضبوط کرتے ہیں، اور پھر انا و لاغیری کا نعرہ گاتے ہیں۔ فوجی حکومت نے پارٹیوں کو ختم کر کے جو ہنگامی حالات کی رسی دراز کرنا شروع کی، عوام میں اضطراب پیدا ہوا۔ اسی اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ اس سلسلے میں ہم انہوں کے مرشد عام شیخ حسن الہضیبی کے اس مکتوب کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو موصوف نے ناصر کو لکھا تھا اور خود پاکستان کے پریس میں شائع ہو چکا ہے۔

اس خط میں شیخ موصوف نے ناصر سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ جمہوریت اور دستوری زندگی کو از سر نو قائم کر دیا جائے اس کے ساتھ دوسری یہ بات پیش کی ہے کہ جو ہنگامی قوانین، احکام اور فیصلے نافذ کیے گئے ہیں ان کو واپس لیا جائے۔ قیدیوں اور نظر بندوں کی بھاری تعداد کو رہا کر دیا جائے۔ نیز پریس پر سے پابندیاں اٹھانی جائیں۔ لیکن ایک امر کی نگاہ میں سب سے زیادہ مشرکیز مطالبہ یہی ہو سکتا ہے چنانچہ ناصر ایسے مطالبے پر اپنے غیظ و غضب کو کس طرح لی جاتے انہوں نے جمہوریت کا مطالبہ کرنے والوں کو اس کا جواب دہ دیا جس کی داستانوں سے آج اخبارات کے صفحے کے صفحے رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔

لیکن سلمی صاحب نے ان وجوہ اختلاف کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ وہ صرف معاہدہ سویر کے اختلاف کا ذکر فرما کر رہ گئے ہیں، اور اس کے بارے میں بھی ان کی رائے یہ ہے کہ اسے انہوں نے پردہ خریب (SMOKE) کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس پردہ خریب کے پیچھے کوئی گھناؤنی مشن نہ چھپی ہوئی تھی؛ سلمی صاحب پردہ چاک کر کے اسے سامنے لے آئے ہیں۔ وہ ہے برسر اقتدار آنے کی تمنا! ذرا ملاحظہ فرمائیے ان حضرات کا

طرز فکر، کہ یہ خود چاہے رائے عام کا قتل عام کر کے آمر مطلق بن بیٹھیں اور پھر اقتدار کو ہمیشہ کے لیے اپنی جاگیر بنالیں یہ ان کا ماننا ہوا اہل استخفاف ہے، لیکن ان سے اختلاف کرنے والے لوگ کسی بہتر سے بہتر نصب العین کے لیے سو فیصدی جمہوری طریقوں سے بھی اگر ملکی معاملات میں ذخیل ہونا چاہیں تو ان لوگوں کے حق میں یہ ایک ایسی گھناؤنی ہوس اور شرارت ہو جاتی ہے کہ جسے فریب کے پردوں میں لپیٹے بغیر کہیں رکھا ہی نہیں جاسکتا۔ مگر بات اتنی ہی نہیں سلہری صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ ہضیبی صاحب کے اندر تنہا خود سب کچھ ہونے (TO BE ALL IN ALL) کی حرص کا فرما تھی اور وہ اصل واحد طاقت (THE REAL AND ONLY POWER) بننا چاہتے تھے۔ قطع نظر اس سوال سے کہ جس منطق کے رد سے آپ کرنل جمال ناصر کے لیے تناسب کچھ بننے کا جواز نکال کے دیتے ہیں وہ ہضیبی کو اس کا حق کیوں نہیں دیتی، ہم دوسری طرف جانا چاہتے ہیں۔ ہمارا سوال صرف یہ ہے کہ ایک منظم طاقت جو ایک انقلاب میں میجر پارٹ ادا کرتی ہے، کیا دوران انقلاب اور اس کے فوراً بعد اس کا کوئی موقع نہیں رکھتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اہم مناصب پر اپنے آدمی ڈالتی اور پھر آہستہ آہستہ سب کچھ (ALL IN ALL) بننے کے لیے پاؤں پھیلاتی چلی جاتی ہے ہوس اقتدار کی ہوا جن ذہنوں میں بھری ہوتی ہے۔ ان کا نقشہ کار یہ نہیں ہوتا کہ پہلے وہ ایوان اقتدار سارے کا سارا دوسروں کے حوالے کر دیں اور پھر پردہ ہائے فریب میں اپنی ہوس اقتدار کو چھپائے کھلیں اس دروازے سے جھانکیں، کبھی اس کھڑکی سے دیکھیں کہ کدھر سے راستہ ملتا ہے اور دوسروں کو آمر بنانے کے بعد پھر ان سے اختلاف کی لڑائی لڑیں۔ اٹا انوان کی پولش اس معاملے میں اتنی زیادہ متقیانہ ہے کہ اس وجہ سے طاقت کی باگ ڈور بالکل غلط ہاتھوں میں چلی گئی۔

انوان کا یہ جرم متعین کر لینے کے بعد کہ وہ برسر اقتدار آنا چاہتے اور سب کچھ تنہا وہ خود بننا چاہتے تھے، اب سلہری صاحب ان کی طرف سے مسلح بغاوت اور ملک کو تباہی اور انتشار کے حوالے کر دینے کے ہولناک خطرات ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ان ہولناک خطرات کو مہصری آمریت کی دی ہوئی یہ خبر خود بخود دھوس بنا دیتی ہے کہ انوان کے قبضے سے اسلحہ کے ذخائر برآمد ہوئے ہیں۔ گویا اب انوان کے خلاف فرد قرار داد مجرم مکمل ہو گئی جس طاقت کے خلاف یہ فرد قرار داد مجرم عائد ہو جائے اس کے ساتھ آخر بجز اس کے اور کیا سلوک روا رکھا جاسکتا ہے جو ناہری آمریت نے روا رکھا ہے۔ یہ بے سلہری صاحب کی بحث کا خلاصہ! ہم صرف اتنا دریافت کرتے ہیں کہ اگر یہ فرد

قرار دادِ حرمِ سونو فیصدی برتنی تھی تو اس میں کیا اعمال ہو کہ انہوں کا معاملہ رسولِ عدلیہ کے حوالے کرنے کے بجائے خود حکمرانوں نے قاضی بن کر فوجی عدالت میں طلب کیا، کیا دلیل ہوا ہے اس بات کے لیے کہ سرسری جماعت کر کے سنگین سزائیں سنا دی گئیں اور نافذ کر دی گئیں، لیکن ناہری امریت سلہری صاحب کی نگاہوں میں اسی معصوم ہے کہ وہ اس کے کسی اقدام سے بھی تعرض نہیں فرماتے۔

ایک اہم سوال | اس بحث کو خاتمے تک لاتے لاتے ہمارے فاضل صحافی دوست نے ایک اہم سوال اٹھایا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب فوجی حکومت انہوں نے یہ نہایت کام کر کے (TO BE GUIDED BY BROTHERHOOD) پر تیار تھی تو کونسا مال تھا کہ وہ اس کے ساتھ تعاون نہ کر سکے، سلہری صاحب نے اپنے لفظ نظر کے مطابق اس کا جواب دے دیا، وہ یہ ہے کہ اس طرح کے انتہا پسند اور زعمِ صالحیت رکھنے والے (SELF RIGHTEOUS) لوگوں کی یہ ایک مستقل کمزوری ہوتی ہے کہ وہ اعتدال اختیار کرنے کے حالات کے نقشے میں اپنی جگہ پیدا کرنے اور دوسروں سے سازگاری کرنے کی خوبی سے محروم ہوتے ہیں۔

ایک تو اس معاملے میں یہ بات دریافت طلب ہے کہ کن دلائل و ثبوت سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ فوجی حکومت انہوں کو پیرو مشر بنا کر کام کرنے پر آمادہ تھی کہ جن جزوی سے جزوی معاملات میں فوجی حکومت نے انہوں کے نقطہ نظر کے مطابق کوئی کام کیا، اور تو اور جو لوگ یہ تک نہ مان سکے کہ بغیر اسلام کا نام لیے، اور بغیر اسلامی حکومت قائم ہونے کا اعلان کیے (کیونکہ اس سے بین الاقوامی طاقتوں کے بگڑ جانے کا خطرہ تھا) کچھ نہ کچھ اصلاحات و تقیرات اسلام کے منشا کے مطابق بھی کر دئے جائیں، اور جو لوگ کہ جمہوریت کی بحالی کے سلسلے میں کسی ادارے کے درجے میں کوئی تدریجی قدم تک اٹھانے پر تیار نہ ہوئے ان کے بارے میں سلہری صاحب یہ دلچسپ انکشاف فرماتے ہیں کہ وہ انہوں کی زیر ہدایت کام کرنے کو بخوشی آمادہ تھے۔ انہوں کا اپنا تصور ہے کہ ایسے لوگوں کا تعاون انہوں نے خود ہاتھ سے کھو دیا۔ دوسرے ہم اس پہلو سے بھی معلوم کیا جتنا کہ اب تک جو حالات سامنے آچکے ہیں ان کے اندر انہوں کے کن کن اقدامات یا مطالبات سے انتہا پسندی اور زعمِ صالحیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

علاوہ بریں ہم اسی سوال کو اگر لٹ کر دوسرے فریق پر وارد کریں کہ وہ انہوں جو جہا و فلسطین کے زطلنے سے فوجی عناصر کے ساتھ دوستی اور رفاقت رکھتے تھے، جنہوں نے جانوں کی بازی کھیل کر انقلاب کے لیے راستہ صاف کیا اور جو خود

انقلاب کے سپاہی بن کر میدان میں کام کرتے رہے، آخر کون سے اسباق کے تحت فوجی آمریت نے ایسے اچھے ساتھیوں کا تعاون کھو دیا اور کیوں نہ وہ ان کے ساتھ سازگاری پیدا کر سکی؟ ایک اتنی عظیم طاقت جس سے آئندہ مصر کی تیسر وزیرتی میں بہت بڑے کام لیے جاسکتے تھے۔ کوئی رکاوٹ پیدا ہوئی کہ فوجی اکابر ان کو باقی رکھ کر ان سے مزید کام لینے کے بجائے ان سے بگڑ بیٹھے اور ان کو موت کے گھاٹ اتارنے پر تیار ہو گئے۔ معلوم نہیں سلمی صاحبہ مصری آمریت کی طرف سے کیا جواب ان کا دیں، ہمارا جواب یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں ڈکٹیٹر شپ جب بھی ابھری ہے ڈکٹیٹر شپ میں دوسروں سے سازگاری (COMPROMISE) پیدا کرنے کے لیے کبھی بھی پلک نہیں پائی گئی۔ دیکھ لیجیے اٹھا کے فرغانہ و قزاقستان کی تاریخ پھر ملاحظہ فرمائیے بٹلر اور موسولینی کے کردار کو، اور پھر جانزہ لے لیجیے روس کے کیونٹ انقلابیوں کے کارناموں کا! پھر خصوصیت سے مسلمانوں کے اندر سے تیرہ سو سال پرانے دین اور اس دین کو ماننے والے "طاؤں" کے خلاف جوش ہوا لے کر اگر کوئی امر اٹھا ہوتا تو وہ مصطفیٰ کمال سے درے درے کہیں تھم نہیں سکتا۔ تزکیہ کے کمال کو مصر کے جمال نے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

جمال ناصر اور اس کی انقلابی کونسل میں اتنی چمک موجود نہیں تھی کہ وہ کسی ادنیٰ درجے میں بھی اسلامی نصب العین کی طرف کوئی ایک دو چار قدم اٹھا کر رائے عام کو راہنی کر سکتی، وہ جمہوریت کی قدروں کے مجھے ہوئے دیوں میں سے کسی ایک آدھ ہی کو انہوں کے مطالبے پر ٹھمانے کا موقع دے سکتی، اور معاہدہ سوئز کو کچھ اور بہتر بنانے اور عزم کو اس کے لیے اعتماد میں لینے کی خاطر تھوڑا سا التوا بھی پیدا کر دیتی، چنانچہ سلمی صاحب کے لقبوں جو جتنا راج بالکل انہوں کی ہدایت اور رہنمائی میں کام کرنے پر تیار تھا اس نے ایک ہی جہت ایسی لگائی کہ پھر وہ انہوں کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ یا وہ انتہا تھی، یا یہ آخری حد! ایسے لوگوں کے ساتھ آخر کون سازگاری پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔

اس موقع پر برہسپن مذکورہ خود پاکستان کے فرماں رواؤں کے بارے میں بھی سلمی صاحب سے یہ دریافت کیا جاسکتا ہے کہ گذشتہ سات برس میں تہادان کی بار بار کی پیشکشوں اور کوششوں کے باوجود کبھی کوئی ایک مثال بھی ایسی سامنے آئی ہے کہ تحریک اسلامی، جماعت اسلامی، ملک کے باطنی دینی عناصر اور اسلامی نظام چاہنے والے عوام کا اعتماد اور عملی تعاون حاصل کرنے کی کوشش ان حضرات نے کی ہو؟ کسی معاملے میں انہوں نے دینی عناصر کے کسی بھی کام کو سراہا ہو؟ کسی ملکی مسئلے میں ان سے مشورہ لینے کی ضرورت سمجھی ہو؟ کبھی ان سے اپنے آپ کو قریب تر لانے کے لیے اپنے فیصلوں اور رجحانات میں

کوئی دلیل پیدا کی ہو، کبھی ان کو کوئی اہمیت دی ہو؟ — کچھ بھی نہیں! شروع سے آج تک برابر حکمراں طبقے نے دینی عناصر کے سامنے اپنے آپ کو ایک آہنی دیوار میں محفوظ کر کے رکھا ہے۔ اس کل کوئی اخبار نویس ان دینی عناصر کی فرد فرادادِ جرم مرتب کرتے ہوئے اگر ان کو انتہا پسند، حالات سے سازگاری پیدا نہ کر سکنے والے، سب کچھ تنہا خود ہی بننے کے حریص اور زعمِ صالحیت میں متبلا قرار دے کر ان کا یہ تصور دنیا پر ثابت کرتا نظر آئے کہ انہوں نے حکمراں طبقے سے کبھی تعاون کر کے نہیں دیا، تو کون اس اخبار نویس کا ظلم پکڑ سکے گا۔

اصل واقعہ بالکل نمایاں شکل میں یوں ہے کہ انہوں نے جس جہتِ دین و وطن طاقت کے تعاون کو مصری آمریت نے خود ہی اپنی انتہا پسندی اور ننگِ ظفر کی وجہ سے ٹھکرا دیا ہے۔ یہ بڑی زیادتی ہے کہ ہزار ہا جینیے جاگتے اور دیکھتے سنتے انسانوں کے سامنے اس واقعہ کی بالکل اٹلی تصویر کھینچ کر لٹکا دی جائے۔

سلفِ صالحین کی طرف اشارہ | اس موقع پر سہری صاحب نے مسلمانوں کی گذشتہ قی تاریخ پر بھی ایک تنقیدی جملہ کہا ہے۔

فرماتے ہیں کہ اس طرح کے سازگاری پیدا نہ کر سکنے والے اگر وہ پہلے بھی بڑے غلوں کے ساتھ صالحیت کے تصورات کا دامن تھامے حکومتِ وقت کے خلاف اٹھتے رہے ہیں، لیکن ان کی مساعی کبھی بار آور نہ ہو سکیں۔ آپ کچھ سمجھیں نہ صرف کہ لوگوں کو ہول پے و بند کر سنبھاری تاریخ کی ان لامتناہی ہستیوں کا جن سے ہمارا ماضی جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔ یہ ان عناصر کی شان بیان ہو رہی ہے جنہوں نے اگر اپنی قربانیوں سے رکاوٹ نہ ڈالی ہوتی تو ہمارے شاہانِ جبار کے ہاتھوں حالات کا فساد اس حد تک چھانچھٹا کہ اسلام کے اساسی اصول اور اس کی درجہ اولیٰ کی تہذیبی و اخلاقی قدیں ملامیٹ ہو چکیں۔ ہاں یہ تذکرہ سے شہدائے کرام کا یہ بیان ہے امام احمد ابن حنبل اور امام مالک کا، یہ اشارہ ہے اہم اوصیفاء کی طرف، یہ ننگی اٹھائی جا رہی ہے مجددِ ملت ثانی کی ہستی کی طرف، یہ موقف بیان ہو رہا ہے سید محمد رشید اور شاہ اسماعیل شہید کا! یہ سب حکومتِ وقت کی بڑی کے علی الرغم دعوتِ حق کے چرخ اپنے خون کے روغن سے جلانے کے مجرم ہیں۔ یہ زعمِ صالحیت سے سرشار ہو کر شاہانِ وقت کی پالیسی سے سازگاری پیدا نہ کر سکنے کے تصور وار ہیں۔ حالانکہ اصل صورتِ واقعہ بالکل برعکس رہی ہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد جب بادشاہت کا تخت چھڑ گیا تو اس پر بیٹھنے والوں میں سے اکثر کا حال یہ رہا ہے کہ وہ اختلافِ رائے کو کبھی برداشت نہیں کر سکے۔ انہوں نے دوسروں کے لیے کبھی اتنی رواداری نہیں دکھائی کہ دربار اور محل کے نظریات کے خلاف دوسروں کو اپنی بات کہنے اور سنانے کا حق حاصل رہے۔ پھر اگر کسی سازگاری پیدا نہ کر سکنے والے نے جرأت مندی کے ساتھ کوئی

کلمہ رتی کہہ دیا ہے تو دلیل سے اس کا ٹوڑ کرنے کے بجائے "تاج" نے ہمیشہ تلوار سے کام لیا ہے۔ آج تک تمام مسلمان اہل علم و فکر پوزیشن کو اسی طرح سمجھتے آئے ہیں اور ملت کی ہمدردیاں پوری کی پوری اعلیٰ کلمہ رتی کے تصور داروں کے ساتھ رہی ہیں۔ یہ شاید پہلا موقع ہے کہ ہمارے ایک صاحبِ قلم نے اس پوزیشن کو الٹ دیا ہے اور ان تصور داروں کے خلاف "تاج" کے مقدمے کی حمایت کی ہے۔

مگر سلمیٰ صاحب اگر ذرا اور اوپر چلے جائیں اور انبیاء کی تاریخ پر بھی اسی طرح نگاہ تنقید ڈالیں تو وہ تہا میں کدو البریکیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، زکریا علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام اور علی علیہ السلام جیسے جلیل القدر انبیاء کے بارے میں کیا رائے دیتے ہیں؟ کون ان میں سے قائم شدہ نظام (ESTABLISHED ORDER) کے ساتھ سازگاری کر سکا؟ کیا تو دنیا پر سب انتہا پسند، زہدِ صالحیت میں مبتلا اور سب کچھ خود ہی بننے کے ترہیں لوگ تھے اور اسی تصور کی سزا انہوں نے بھگتی؟ آدمی جب ایک غلط نقطہ نظر کو زادِ راہ بنا کر تحقیق و تبصرہ کے سفر پر چل کھڑا ہوتا ہے تو پھر وہ ایسے ایسے کنوٹس جھانکتا کہ عقل کا سر جھکا جاتا ہے۔

اوپر کی اس سناری بحث سے سلمیٰ صاحب پاکستان کے لیے درسِ عبرت اخذ کرنے میں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے لئے پاکستان میں چوکنا بوجانا ضروری ہے، کیونکہ ہم اس طرح کی گمراہ شدہ تحریکات کے خطرے سے آزاد نہیں ہیں لیکن عبرت کا یہ سبق پڑھاتے ہوئے وہ بہت سی اہم اہم قیمتی باتیں بیان کرتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان باتوں کا جائزہ بھی لیا جائے۔

برطانوی رواداری کی مثال | ہمارے فاضل صحافی دوست نے بڑے حسرت بھرے انداز میں اپیل کرتے ہوئے یہ لکھا کہ میٹھا پھل صرف ان سوسائٹیوں نے دیا ہے جن میں رواداری کی فضا قائم ہے۔ مثال کے طور پر وہ برطانوی معاشرے کے سامنے لاتے ہیں۔ جہاں مجرد خیالات کے عمل و رد عمل کے ذریعے ادارات میں تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں۔

ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس مثال کو ادارے میں پیش کرتے ہوئے سلمیٰ صاحب نے یہ خیال بھی فرمایا کہ مصر میں ناصر کی آمریت، یا خود پاکستان میں حکمران طبقے کی پالیسی کیا اس معیار پر کسی ادنیٰ درجے میں بھی پوری اتزتی ہے؟ رواداری کی فضائیاں میں بڑا حصہ حکمران طاقت کا ہونا ہے جو پلے درپلے ایسی روایات اور ایسے نظائر قائم کرتی ہے کہ جن سے تزیتِ پاکر سیاسی جماعتیں اور عوام باہم دگر زیادہ سے زیادہ روادار ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے یہ نصیبِ مسلم ممالک میں حیدر خود حکمران طاقتیں ہی دستوراً تدریجاً، جمہوری روایات اور رواداری کے تقاضوں کا دن رات گلا

گھونٹ رہی ہوں تو جماعتوں اور شہریوں کے سامنے برطانیہ کی مثال لالا کے رکھنے سے فائدہ ہے وہاں کمریت قائم ہے اور یہاں آزادی کے دستور سے محروم ایک قوم ایسے اکابر کے پنجہ گیر میں ہے جو جمہوریت کے نام کی نقاب اوڑھے ہوئے مستبدانہ قوانین اور ہنگامی اختیارات کے ذریعہ ہائے پنہاں آئین میں لیے شہری آزادیوں پر برابر عنایات فرماتے رہتے ہیں۔ ایسے میں جماعتیں اور افراد زیادہ سے زیادہ جیل نارواداری کے مجرم ہیں وہ بس یہ ہے کہ اپنے حاکموں کی نشان رواداری کے خلاف وہ فریاد کرتے رہتے ہیں۔ سلہری صاحب شاید یہ چاہتے ہوں کہ ان سے فریاد کا یہ حق بھی لے لیا جائے۔ کیا اس کے بعد برطانیہ جیسی رواداری کی فضا بن جائے گی ؟

اضطراباتِ پنجاب کا حوالہ دینی عناصر کی عدم رواداری کے ثبوت میں اس موقع پر سلہری صاحب اضطراباتِ پنجاب کا تذکرہ بڑے دردناک انداز میں کرتے ہیں۔ بلاشبہ اس واقعہ میں کئی پہلو ایسے ہیں جن کو خود دینی عناصر میں سے بھی کوئی صحیح قرار نہ دے گا۔ لیکن اس واقعہ کے اندر سے دینی عناصر کی عدم رواداری کا ثبوت نکال کے سامنے لاتے ہوئے ایک منصف مزاج آدمی کو دوسرے فریق کا معاملہ بھی زیرِ تبصرہ لانا چاہئے تھا۔ آپ یہ فرمائیے کہ اگر برطانیہ میں کوئی ایسا کرب انگیز معاشرتی و سیاسی مسئلہ موجود ہوتا جس کی وجہ سے باشندگانِ ملک مسلسل پچاس برس سے تڑپ رہے ہوں تو کیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہاں کی حکمران طاقت اس سے آنکھیں بند کیے پڑی رہتی ہے اس مسئلے پر خیالات کے میدان میں اگر شور مچتا تو وہ کانوں میں روٹی ٹھونس لیتی ہے؟ اگر اس کے بارے میں اس کے سامنے دلائل لائے جاتے تو وہ اس کا جواب دلائل سے دیتے میں پہلوتنی کرتی ہے؟ اگر اس پر جلسوں اور قراردادوں کا طوفان اٹھتا تو وہ اسے دفعہ ۱۴۲ اور سنیٹ ایکٹ کے زور سے روکتی ہے؟ اگر اس پر مظاہرے ہوتے تو لالھیوں اور گولیوں سے جواب دیتی ہے پھر جب اس کی اپنی کوتاہی سے معاملات اور آگے بڑھ جاتے تو وہ مارشل لارنگ کر لوگوں کو فوجی عدالتوں سے سنگسار سنزائیں دلا کر مطمئن ہو جاتی کہ اس نے رواداری کا حق ادا کر دیا ہے

کچھ میں نہیں آتا کہ سلہری صاحب ایک فریق کو کام کر رہے یعنی اور دوسرے کو ستر یا قصور وار ٹھہرانے کی اس پوزیشن میں رواداری کے کس اصول کے تحت اپنے آپ کو نصب کرتے ہیں۔ انہوں نے اگر ہر دو فریق کو ایک جگہ کی غیر جانبدارانہ نگاہ سے دیکھا ہوتا تو ان کا اداریہ سر پرٹھنے والے کو متاثر کر سکتا۔ لیکن وہ تو شروع سے آخر تک جانبدار وکیل بن کر لوٹے ہیں اور اسی وجہ سے ان کے قیمتی خیالات کا وزن بہت کم ہو گیا ہے۔

پاکستان کا اسلامی ریاست ہونا | اب فاضل مدیر اس مرکزی موضوع کو چھپرتے ہیں جس کے گرد یہ ساری کی ساری بحثیں گھوم رہی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں اسلامی ریاست کے تصور اور ڈھانچے پر بڑی بحث و تجویز پائی جاتی ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان نے اسی چیز کے لیے زندگی اور موت کی بانی کھیل ہے۔ اور اس لیے پاکستان اسلامی ریاست کے سوا اور کچھ نہیں بن سکتا۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ بالقرع صحیح معنوں میں ایک مکمل اسلامی ریاست ہے۔ دلیل ہے یہ کہ مسلمانوں اور نہما مسلمانوں نے اسے قائم کیا ہے۔ درحقیقت کہنا یہ چاہیے تھا کہ چونکہ اسے مسلمانوں نے قائم کیا ہے لہذا چاہیے یہی کہ یہ ایک اسلامی ریاست ہو۔ لیکن سلمیٰ صاحب کہتے ہیں کہ یہ ایک ٹھیک ٹھاک اسلامی ریاست ہے، کیونکہ اسے مسلمانوں نے بنایا ہے۔ مثلاً ایک کاروباری ادارے کو اگر مسلمان قائم کریں تو چاہیے یہی کہ کاروبار اسلامی خطہ پر چلے، لیکن اگر اس کے بجائے یہ کہا جائے کہ چونکہ ایک ادارے کو مسلمان چلا رہے ہیں، لہذا چاہیے وہ ستراب ہی کا دربا کیوں نہ کر رہا ہو اور جھوٹ اور فریب کے سٹھکنڈوں سے کیوں نہ نفع کمایا جا رہا ہو، وہ بالفضل اسلامی ہے۔ تو یہ بات بالکل مضحکہ انگیز ہی ہوگی۔ مسلمانوں کے ہاتھوں بادشاہت کی ذیل ترین صورتیں قائم ہوئی ہیں۔ آج وہ آمریت چلا رہے ہیں، کہیں وہ مادہ پرستانہ جمہوری نظاموں کو لے کے چل سکتے ہیں۔ روسی ترکستان میں کمیونسٹ حکومت چل رہی ہے اور اس کے بے شمار پرزے خود مسلمان ہیں، کیا ان ساری صورتوں میں نظام کو ہم اسلامی سمجھیں گے اور اس کے تمام وظائف اور اقدامات کو مطابق اسلام قرار دیں گے؟ پہلے فارمولہ متعین کیجیے۔ وہ باتوں ہوگا کہ مسلمان جو کچھ کریں اسلامی ہے، یا یوں ہوگا کہ جو کچھ اسلام کے مطابق کیا جائے وہ اسلامی ہوگا۔ افسوس ہے کہ سلمیٰ صاحب نے پہلا فارمولا اختیار کیا ہے جو ہر حصہ باطل ہے۔ تاہم وہ فرماتے ہیں کہ اسلامی ریاست کے اس وسیع تصور کے دائرے میں کوئی بحث اختلاف نہیں۔ بحث و اختلاف نسبتاً چھوٹے دائرے میں ہے۔ یعنی نظریاتی، ذہنی اور دستوری دائرے میں اختلافی بحثیں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں اگر معاملہ اپنی اپنی رائے کا ہو جاتا ہے۔ اسلام میں کوئی کلیسائی ادارہ (CHURCH) نہیں اور کسی مذہبی طبقے کی کوئی حیثیت ہے کہ وہ اپنی رائے عام لوگوں پر ٹھوس دے!

کسی مودودی کا تعلق رائے دی | ادارہ کے اس حصے میں جیسے ایک جھلا پھٹ ہوا ہے۔ فرماتے ہیں کہ مشکل یہاں سے پیدا ہوئی کہ کوئی مودودی یہاں اور کوئی احتشام الحق وہاں سے ادعا کرتا ہے کہ ان کے رائے کوئی ایسی ذہنی سند رکھتی ہے کہ لوگوں کو چپ چاپ اس کے آگے جھک جانا چاہیے۔ مولانا احتشام الحق کی طرف سے تو ہمیں بولنے کا اتنا زیادہ حق حاصل نہیں البتہ

مودودی صاحب کے بارے میں اتنا ضرور کہنے کو جی چاہتا ہے کہ مولانا مودودی نے گذشتہ ۱۲، ۱۵ برس میں کوئی سیری
 مریدی کا سلسلہ تو نہیں چلایا ہے کہ لوگوں سے آنکھیں بند کر کے اپنے ہاتھ پر سبت کرنے کا مطالبہ کیا ہو۔ انہوں نے کرامات
 اور شعبدے دکھا کر تو دنیا کو سخر نہیں کیا! انہوں نے سیفی ایکٹ کا ڈنڈا ہاتھ میں لے کر تو دنیا کو مجبور نہیں کیا کہ مجھے اتھائی
 مانا! انہوں نے دوسروں کی زبان بندی اور قلم بندی کے احکام تو نہیں جاری کر لئے! انہوں نے اختلاف کرنے والوں کو
 پھانسی اور قید باسقت کی سزا میں تو کبھی نہیں دیں! مولانا مودودی نے ۱۹۳۲ء سے لے کر آج تک ڈیل سے اپنی بات پیش
 کی ہے، انہوں نے نشر و اشاعت کے ذرائع سے کام لیا ہے، علی جماس میں خطاب کئے ہیں، جلسہ ہائے عام میں تقریریں
 کی ہیں، دکلاہ کی انجمنوں میں بیٹھ کر مذاکرات کئے ہیں، لوگوں کے سوالات اور اعتراضات کے جواب دئے ہیں، گامیاں کھائی ہیں
 الزامات کے حملے سپہے میں اور رائے عام کے میدان کا ایک ایک انج حصہ دیں کے معرکے لڑ کر فتح کیا ہے۔ آپ فرماتے
 ہیں کہ بہت سے مدارس فکر موجود ہیں کہ جن کو باہم دیگر اختلاف ہے تو کیوں کسی ایک کی بات مان لی جائے جب کہ اس کے لیے
 کوئی اسلامی سند موجود نہ ہو۔ اس کے جواب میں قابل عمل صورت وہی ہے جیسے آپ خود اس ادارے میں پیش فرماتے ہیں
 جس کے پاس کوئی نظریہ و فکر ہو، وہ اسے لے کر رائے عام کے میدان میں آئے، اپنے دلائل پیش کرے، لوگوں کو
 مطمئن کرے اور پھر جس چیز پر اکثریت مطمئن ہو کہ اسلامی ریاست کا یہی تصور وہ پسند کرتی ہے وہ جمہوری اصول پر نافذ چاہیے
 یہی راستہ مولانا مودودی نے اختیار کیا ہے۔ اس پر وجہ تکرر کیا ہے! آخر آپ بتائیے تو یہی تو کسی مودودی اور کسی احتشام الحق
 نے آپ سے یہ حق سلب کر لیا ہے کہ آپ اپنے تصورات کو نہ لائیں اور ان کے لیے دلائل لے کر عوام کو ساتھ نہ لیں۔ اگر
 کسی کا یہ جرم ثابت ہو جائے تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہو کر کہیں گے کہ اسے ضرور پھانسی دے دی جائے۔

لیکن انداز گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلمی صاحب چاہتے ہیں کہ کسی مودودی اور کسی احتشام الحق کو سرے سے
 اپنے نظریہ و تصور کو پیش ہی کرنے کا حق نہ ہونا چاہیے، اور اگر یہ حق ہو بھی تو ان کو اپنی بات ایسے قومی دلائل اور ایسے مؤثر
 انداز سے ہرگز نہ پیش کرنی چاہیے کہ مسابقت استدلال میں وہ بازی جیت بھی جائیں۔ وہ اگر بازی جیت جائیں تو ان پر الزام

لے اس کی ایک مثال قادیانی مسئلہ، نامی پمفلٹ ہے۔ مولانا نے اس میں مسئلہ کے مختلف پہلو دلائل کے ساتھ پیش کر کے یہ چاہا تھا
 کہ اگر ان کے خلاف کسی کے پاس دلائل ہوں تو وہ ضرور پیش کئے جائیں۔ لیکن دلائل کا جواب دلائل سے نہیں۔ کورٹ مارشل سے
 دیا گیا ÷

دکھا جائے کہ تم حکمانہ اقتدارٹی کے ساتھ اپنی رائے دوسروں پر ٹھونٹنا چاہتے ہو۔

سلہری صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ نظریات و تصورات کے انتخاب کا حق عوام کو ہونا چاہیے۔ ضرور ہونا چاہیے چنانچہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے عوام کے اسی حق کو سامنے رکھ کر اسلامی دستور اور اسلامی نظام کے تصورات ہمیشہ عوام تک پہنچائے ہیں اور جو مطالبہ بھی پیدا ہوا ہے عوام ہی کے اندر سے پیدا ہوا ہے۔ پھر ادارہ میں لکھا گیا ہے کہ پارلیمینٹری ادارت عوام کے اجتماعی تصور اسلام کے اظہار کا مناسب ترین ذریعہ ہیں۔ اور اسی ذریعہ سے کسی چیز کو نافذ ہونا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ کیا مودودی صاحب یا جماعت اسلامی نے کوئی مسلح بغاوت کر کے یا کسی بااختیار فرد کے سر پر ہتھول رکھ کر کوئی بات آج تک منوائی ہے اور کبھی پارلیمینٹری راستے سے ہٹ کر اپنے دستوری تصورات کو ملک پر مسلط کرنے کی کوشش کی ہے؟ اب تک اس سلسلے میں جو کچھ ہوا ہے انہی پارلیمینٹری ادارت کے ذریعے ہوا ہے۔ قرارداد مفاد اسی ذریعے سے پاس ہوئی تھی، رہنما اصول اسی طریقے سے طے پائے تھے اور مودودے دستور نے ایک خاص شکل اسی طریقے سے اختیار کی تھی۔ لیکن دوسری طرف سے اس دوران میں قدم قدم پر رتبے عام کو دبانے اور اس سے انحراف کرنے اور اس کے خلاف سازشیں کرنے کی تدبیریں لڑائی جاتی ہیں۔ آخر میں جب ان تدبیروں کے علی الرغم کسی نہ کسی حد تک اسلامی خطوط پر دستور سازی کا کام مکمل کو پہنچا تو سرے سے دستور یہ کا وجود ہی ختم کرنے کی کوشش کر ڈالی گئی۔

ایک ایک حرف جو سلہری صاحب نے لکھا ہے کہ یہ ہونا چاہیے اور یہ نہ ہونا چاہیے، وہ ٹھیک اسی موقف کی تصویر میں کرتا ہے جسے جماعت اسلامی نے اختیار کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آسکا کہ پھر اعتراض کس چیز پر ہو رہا ہے اور درس عبرت کس معاملے میں دیا جا رہا ہے؟

ہاں! آخر میں یہ بھی پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ جن عوام کو سلہری صاحب بار بار فائل اتھارٹی اور فیصلہ کن طاقت قرار دے رہے ہیں، ان کی اتھارٹی اور ان کے اختیار کی کیا گت گذشتہ سات برس میں بنتی رہی ہے اور آج کیا بن رہی ہے۔ عوام کو کب کسی نے پوچھا ہے کہ تم کون ہو، کہاں رہتے ہو، کس طرح سوچتے ہو، کیا چاہتے ہو؟ مسلم لیگ کا تعلق پاکستان ہستی عوام سے کٹ چکا جھکرا طبع کا حال یہ ہے کہ وہ پیروں میں چلتا ہے اور ریڈیو پر سے وعظ کہہ دیتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ ہمارے اکابر کسی مسئلے کو لے کر میدان میں آئیں، لوگوں کی آنکھوں سے آنکھ ملا کر بات کریں، اپنے دلائل دیں اور ان کے دلائل نہیں، معلوم کریں کہ ان کے مسائل اور مطالبات کیا ہیں، وہ کیسا نظام زندگی چاہتے ہیں اور وہ کن تبدیلیوں کے لیے بھین ہیں؟

انسانی نہیں کہ عوام سے قریب ہو کر ان کے دلوں کی دھڑکنیں سنی نہیں جاتیں، اٹا یہ ہوتا ہے کہ عوام کسی مسئلے پر جب مطالبات لے کر اٹھتے ہیں اور ان کے اضطراب کی لہریں ملک کے گوشے گوشے سے آ کر ایوانِ اقتدار سے ٹکرائی ہیں تو ایوان کے دروازے بند کر لیے جاتے ہیں۔ کیا سلمیٰ صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ دستور کے مسئلے پر پوری قوم نے ایک ہی سرے کھیلے سات سالوں میں کیا تمناؤں دستور یہ اور حکمران پارٹی کے سامنے رکھی ہیں؟ کیا سلمیٰ صاحب ناواقف ہیں کہ ماٹریلا کے ایسروں کے بارے میں ملک کی کوئی تنظیم اور کوئی کمی ایسی نہیں رہی جس کی طرف سے صریح بے انصافی کے ازالہ کا مطالبہ نہ کیا گیا ہو؟ پھر ان اصل اتھارٹی اور اختیار رکھنے والے عوام کو کیا جواب ملا؟

اب تو عوام کے متعلق ذمہ دار ترین لوگوں کی طرف سے کھلم کھلا یہ کہا جانے لگا ہے کہ یہ جمہوریت کے دل نہیں، معاملات کی سوچھ بوجھ نہیں رکھتے، مذہبی رُومیں بہہ جاتے ہیں اور ہکانے والوں کے ہاتھوں میں کھیل جاتے ہیں جن عوام کو یہ سہرا سرٹیفکیٹ دیا جا رہا ہو، ان بجا روں پر فاضل اتھارٹی ہونے کا الزام بہت ہی بڑی زیادتی ہے۔ ناحق ہم جمہوروں پر یہ تخت ہے خناری کی۔ چاہتے ہیں جو آپ کی میاں ہم کو عبث بدنام کیا۔ یہ اگر آپ لوگوں کی سر بات ایمان لے آیا کریں تب تو یہ فاضل اتھارٹی ہونے کے حق دار ہوں بھی، لیکن جب یہ اپنے مذہب کو سینے سے لگائے ہوئے ہوں اور کوئی صلہ اختلاف بند کر دیں تو پھر یہ جمہوریت سے نوازے جانے کے مستحق ہی نہیں رہتے۔

فی الواقع اگر آپ لوگ عوام کو آخری فیصلہ کن طاقت قرار دیتے ہیں تو آئیے، آج آئیے اور اپنے نظریات تصورات کو آپ ان کے سامنے رکھ دیجیے اور دوسری طرف تمام دوسرے لوگوں کو موقع دیجیے کہ وہ بھی اپنے اپنے نظریات و تصورات پیش کر دیں۔ ایک کھلے کھلے انصواب رائے کے ذریعے فیصلہ کر لیجیے کہ آخری فیصلہ کن طاقت کس کو قبول کرتی اور کسے رد کرتی ہے۔

(۳)

اب بحث کا تیسرا حصہ سامنے آتا ہے اور اصل تغیر برآمد ہوتا ہے، مایا یوں کہنے کے جو سبق سلمیٰ صاحب پاکستان کو دینا چاہتے ہیں وہ اس حصے میں دیا جا رہا ہے۔ اس نتیجے یا سبق کے دو جزو ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام کے نام پر ریاست کے میدان میں کسی کو کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ کسی کے نظریات دوسروں پر ٹھونسنے نہ جائیں۔ بحث کے حصے میں بھی ان دو نکات کو پیش کرتے ہوئے ایسی باتیں کہی گئی ہیں کہ جن کا ناقدانہ جائزہ لینا مفید ہوگا۔

سیاسی تنظیمیں اسلامی نہ ہونی چاہئیں | سلمیٰ صاحب بتاتے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کو باہم دیگر اختلاف و تنقید سے کام لینا چاہیے

اور اس بنا پر یہاں اوقات بڑھ چکا ہے مثلاً انگلستان کے ٹوری سوسائٹیوں کو انٹرنیشنل (ANARCHIC) اور نظم شکن قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف سے پلیٹ کراڈیٹل پینوں (CONSERVATIVES) کو خون چوسنے والے سڑک مار کہا جاتا ہے۔ اب بڑا پیچیدہ مسئلہ یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ایک سیاسی تنظیم اسلام کی علمبردار بن کے اٹھے، مثلاً جماعت اسلامی، تو وہ اپنے مخالفین کو کیا کہے گی؟ جس کا نام گلوچ سے پہلے اپنے دائرے سے باہر کے لوگوں کی توضیح کر سکتی ہے وہ کافر اور ملحد کہنے کے علاوہ اور کیا ہوگی! یہ پیچیدہ مسئلہ پیش کرتے ہوئے سلمی صاحب اس کے عملی ثبوت کے طور پر یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی آٹے دن اختلاف کرنے والوں کے لیے ہی کلمات استعمال کرتی رہتی ہے، چنانچہ مسودہ دستور میں ترمیم چاہنے والوں کے خلاف اس کے ترجمان نے ٹھیک ہی انداز اختیار کیا تھا۔

پہلے اس عملی ثبوت کے بارے میں بات کر لینا ضروری ہے۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں مسودہ دستور میں ترمیم کرانے کے لیے نہیں بلکہ دستور پر نوٹوں کا مشترکہ نعرہ متحدہ محاذ کی طرف سے اٹھا تھا۔ اس نعرے کے بارے میں خود مسلم لیگ اور سرکاری اور قوم پرست حلقوں نے ہی تاثر دیا تھا کہ یہ کچھ کمیونسٹوں، تحریک پسندوں، مفاد پرستوں اور اسلامی دستور کے مخالفوں کا اٹھایا ہوا نعرہ ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ کمیونسٹ اور اسلامی دستور سے چڑنے والے عناصر جہاں جہاں بھی تھے انہوں نے اس کی تائید میں پورا زور صرف کیا تھا۔ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے ایک قرارداد میں اس تحریک نعرہ کی تردید کرتے ہوئے اس کے علمبردار عناصر کو غرض ایک واقعہ ہونے کی حیثیت سے پیش کر دیا تھا کہ یہ آواز کیسے لوگوں کی ہے۔ درحقیقت اس استباہ کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایسے لوگوں کے اٹھائے ہوئے نعرے کی گہرائیاں عام لوگ سمجھیں اور کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، نہ یہ کہ جو کوئی بھی اخلاص یا غلط فہمی کے تحت اسے اختیار کرتا جائے۔ اس پر ایک مذہبی گالی چسپاں ہوتی چلی جائے۔ دوبارہ یہی نعرہ اکتوبر میں اٹھا تو پھر اس کی پہلی "ہو" اٹھی صفوں سے بلند ہوئی جن کو مارچ سے لوگ جانتے تھے۔ اب یہ تو "اسرار دردن پڑ" کا معاملہ تھا کہ اقتدار کے لیے ٹھکانے کرنے والے دو دھڑوں میں سے ایک نے اندر ہی اندر اس رد شدہ نعرے سے کوئی مفید کام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اب اس نعرے کے جھنڈے تلے بڑے بڑے حضرات کا ہوا انہو جمع ہو گیا تھا ان میں سے ہر ایک خواہ مخواہ ان الفاظ کو اپنے اوپر اوڑھ کر مظلومی کی شان سے سامنے آتا ہے کہ دیکھیے جماعت اسلامی والے اپنے سوا دوسروں کو ملحد اور کمیونسٹ کہتے ہیں۔ بھائی کے معلوم تھا کہ آپ جیسے اسلام نواز حضرات بھی اب اس جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے جیسے گاڑنے والوں نے جب گاڑا تھا تو خود آپ ہی کی صفوں سے ان کو کمیونسٹ اور ملحد کہا گیا تھا۔

اب لیجئے، جماعت اسلامی کی روش کو۔ جماعت کا طریقہ سرگز یہ نہیں ہے کہ وہ مجرد اختلاف کرنے کی بنیاد پر کسی بھی
 مؤمن کو کافر یا ملحد یا کچھ اور کہے۔ وہ اپنے آپ سے ہر فرد بشر کو اختلاف کا کھلا حق دیتی ہے، اور دوسروں کے مقابلے میں
 یہی حق اپنے لیے چاہتی ہے۔ اختلاف جیسا کسی سے ہوتا ہے، اسی کے مطابق وہ اس کی فکری پوزیشن کو بیان کر دیتی ہے۔
 مثلاً اگر کوئی جمہوریت کے کسی اصول سے انحراف کرتا ہے تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ یہ جمہوریت کی مخالفت ہے۔
 قانون و عدل کے صریح تقاضوں سے کوئی روگردانی کرتا ہے تو وہ فقط یہی کہتی ہے کہ یہ انصاف اور قانون کا غم احترام ہے۔
 کوئی معاشی دائرے میں استحصال کرتا ہے تو وہ یہ کہتی ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ یا جاگیردارانہ اطوار ہیں۔ نہ یہ کہ وہ ہر اختلاف کے
 دوسروں کو کافر اور ملحد کہہ ڈالتی ہو۔ پھر جہاں تک تکلیف کے الزام کا تعلق ہے، اس سے جماعت کا دامن قطعاً پاک ہے "ملحد"
 اور کمیونسٹ کے الفاظ البتہ ایسے ہیں جو اپنے ناگزیر موقعوں پر استعمال ہوئے ہیں۔ الحاد اس کو کہتے ہیں کہ اسلام کو ماننے والے
 آدمی اس میں یڑھ لگا لے اور انحراف کی کھلی کھلی صورتیں اختیار کرے۔ اب سلمری صاحب اپنے معاشرے کو سامنے رکھ
 بتائیں کہ کیا یہاں مسلمانوں کے ناموں کے ساتھ ایسے بے شمار افراد موجود نہیں ہیں جو اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں، اسلامی
 نظام کو ڈھکوسلہ سمجھتے ہیں، اسلام کے دستوری تصورات پر پھینتیاں کتے ہیں، اس کے عملی تقاضوں سے فرار کرنا چاہتے
 ہیں اور اس کے اجتماعی مطالبات کو رد کرتے ہیں؟ اگر سلمری صاحب چاہیں تو ہم نام لے کر ان ممتاز ہستیوں کا تعارف
 کرا دیں جو پاکستان کے اسلامی ریاست قرار پانے کی صورت میں شرم کے مارے اپنی گردن دنیا کے سامنے اٹھانے کے
 قابل نہیں رہتے، جو قراردادِ مفاصلہ کو اس نقطہ نگاہ سے دیکھنے والے ہیں کہ جیسے پاکستان کے دامنِ عزت پر کوئی گھناؤنا
 دھبہ لگ گیا ہے، جن کا حال یہ تھا مسودہ دستور میں ریاست کے تسمیہ (NOMENCLATURE) کی دفعہ نے
 حیب پاکستان کا نام جمہوریہ اسلامیہ پاکستان تجویز کر دیا تو وہ بیچ ذناب کھاتے رہ گئے۔ آخر حجب یہ عنصر ہمارے ہاں
 موجود ہے اور حجب کمیونسٹوں کی ایک تعداد یہاں کام کر رہی ہے تو کوئی بھی کام کرنے والی جماعت ان کے موجود ہونے کے
 کیسے آنکھیں بند کر سکتی ہے اور کیسے ان کی حرکات سے چشم پوشی کر سکتی ہے۔ یہ عناصر اگر کوئی اقدام اپنے نظریات کے
 مطابق کریں گے تو اس کام کو اجنبی سے منسوب کیا جائے گا، نہ یہ کہ ملحد اور کمیونسٹ عناصر کے کارناموں کو حجیت العلماء اور
 مسلم لیگ کے نام سے بیان کیا جائے۔ ان عناصر کے لیے آخر آپ کو کس نام تجویز کر کے دیتے ہیں کہ اس سے ان کو ہجوم
 کر کے بات کی جائے۔

اصل الجھن جس وجہ سے پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں بہتر زندگی اور بہتر مسلک کے لوگ اپنے آپ کے جزاآت کے ساتھ ایسے نام سے پیش کرتے اور ایسے نام سے موسوم ہونا چاہتے ہیں جو ان کے طرز فکر اور مسلک کو ظاہر کرتا ہو۔ لیکن ہماری صفوں میں ملحد اور کمیونسٹ دونوں ہی عنصر یہ عجیب پوزیشن اختیار کر کے رہنا چاہتے ہیں کہ وہ خیالات، طرز عمل اور سرگرمیوں کے لحاظ سے تو اتحاد اور کمیونزم کے علمبردار ہیں۔ لیکن اخلاقی جزاآت کی کمی کی وجہ سے اپنے آپ کو ملحد اور کمیونسٹ کے نام سے سامنے نہیں لاتے۔ اب اگر کوئی دوسرا ان کے خیالات اور مسلک کے نام سے ان کا صحیح نام لے دیتا ہے تو وہ اس کے گلے پڑھتے ہیں کہ تم اختلاف کرنے والوں کو گالی دیتے ہو! معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایک مسلم معاشرے میں اپنا کام منافقت کی ایک نقاب ڈال کر جاری رکھنا چاہتے ہیں اور اگر کوئی اس نقاب کو سر کاٹتا ہے تو یہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اسلامی نظام کے خلاف صریح طور پر بغض رکھنے والے، اسلامی دستور کا ذکر چھپتے ہی پسیدہ پسندینہ جملے والے اور کتاب و سنت کا نام آتے ہی استعمال پذیر ہو جانے والے سب کے سب یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ اپنے خیالات اور طرز فکر کے لحاظ سے ہرگز نہ پہچانے جائیں، بلکہ اسلام کے مخلص ترین خادموں میں شمار ہوں۔ سلمری صاحب! یہ پردہ منافقت ہے جو اصل پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ یہ تجاد بھیجیے تو کوئی الجھن نہیں ہوگی۔ کچھ لوگ اپنے آپ کو صاف صفا طریقی سے اگر اسلامی نظام کی دعوت کے ساتھ لا رہے ہیں، تو کیوں نہ کچھ دوسرے لوگ کھلم کھلا اسلامی نظام کی مخالفت کا علم اٹھانے کے میدان میں کام کریں اور کہیں کہ ہم ملحد اور کمیونسٹ ہیں، ایک مادہ پرستانہ سیکولر نظام چاہتے ہیں، ہیں اسلام وغیرہ سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ یوں اگر ملنے عام کے کھلے میدان میں مسابقت رہے تو بہت آسانی سے ادھر یا ادھر فیصلہ ہو سکتا ہے۔

جماعت اسلامی کا نام | بحث کا یہ پس منظر بنا چکنے کے بعد سلمری صاحب جماعت اسلامی کے نام پر اعتراض اٹھاتے ہیں اور وہ شاندار استدلال کرتے ہیں کہ آدمی عین عین کر اٹھتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس نام کے معنی یہ ہیں کہ جماعت کے علاوہ دوسرے تمام لوگ اسلام کے دائرے سے باہر ہو گئے۔ جی ہاں! مسلم لیگ نام کی اگر ایک جماعت موجود ہو تو وہ گویا یہ کہتی ہے کہ اور جنہی بھی جماعتیں ہیں وہ مسلمانوں کی نہیں غیر مسلموں کی ہیں۔ اگر ایک جمعیت العلماء موجود ہو تو وہ گویا اپنے نام کے ذریعے یہ اعلان کرتی ہے کہ باقی سب جمعیتیں "جہلاء" کی ہیں۔ کوئی ادارہ خدمتِ خلق موجود ہو تو گویا یہ نام رکھ کر وہ دوسرے تمام اداروں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ سب خدمتِ نفس کے ادارات ہیں۔ اسلامیہ کانٹرا اگر کوئی

پایا جائے تو وہ گویا پکار پکار کر دوسرے نام کالجوں کا غیر اسلامی ہونا واضح کرتا ہے۔ "طلوعِ اسلام" نام کا کوئی خریدہ نکلے تو اس کا سرورق گویا دوسرے نام جرائد کو "طلوعِ کفر" کا اہق قرار دیتا ہے۔ اداروں اور جماعتوں کو چھوڑ کر اسی دلیل سے افراد کو لیجیے تو ماننا پڑے گا کہ اگر کسی شخص نے اپنا نام غلام محمد رکھ لیا ہو تو گویا وہ دوسرے کروڑوں بھائیوں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ محمد کے نہیں، کسی اور کے غلام ہیں۔ اگر کسی کا نام عبداللہ ہو تو وہ دوسروں پر بالوالا مسطرہ طرین سے یہ الزام لگاتا ہے کہ وہ عبادِ الشیطن ہیں۔ کوئی شخص اگر "سعادت" اپنا تخلص اختیار کر لے تو باقی دنیا پتھر کا تخلص خواہ مخواہ چپک جائے گا۔ یہ دلیل بازاری سطح کے لوگوں سے تو پیدل بھی سنی تھی لیکن اس پر بڑی مایوسی ہوئی کہ پاکستان کا ایک ممتاز اخبار نویس بھی اس کو ایک برہانِ قاطع بنا کے لے آیا۔ اس برہانِ قاطع کی بنیاد پر سلمیٰ صاحب چاہتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کے نام کو ممنوع (BAN) ٹھہرا دیا جائے۔ دلچسپ امر یہ کہ وہ یہ بھی اجازت مرحمت فرماتے ہیں، بلکہ کچھ اصرار بھی کرنے سے ہیں کہ ہماری جماعتوں کا پروگرام اسلامی اصول و مقاصد سے مالا مال ہونا چاہیے لیکن بس وہ اسلامی نہ کہلائیں، مٹھائی بنائیے، اس میں ٹنکر ضرور ملائیے، اسے خوب میٹھا کر لیجیے لیکن اس کا نام مٹھائی نہ رکھیے۔ بلکہ حنظل رکھیے درنہ اگر آپ نے اپنی مٹھائی کا نام کہیں مٹھائی رکھ لیا تو آپ دوسروں کی مٹھاس کی نفی کرنے کے مجرم بن جائیں گے۔ آپ ایلو پیٹیک دواؤں کی دکان کھولیں تو اس کے بورڈ پر یہ واضح نہ کریں کہ یہاں ایلو پیٹیک دواؤں ملتی ہیں، بلکہ باہر یہ لکھیے کہ یہاں سے بھوسہ اور چارہ مل سکتا ہے۔

دنیا میں نام ہمیشہ حقیقتِ شے کو واضح کرنے کے لیے تجویز کیا جاتا ہے۔ پارٹیوں اور جماعتوں کے نام ان کی فکر اور ان کے پروگرام کو پیش کرنے والے ہوتے ہیں۔ اگر دنیا میں یہ لطائف کبھی نہیں پیش آتے کہ کیولرسٹ، سٹیٹسٹ، جمہوری یا کسی اور نظریہ کی جماعت کو مطالبِ حقیقت ناموں سے موسوم کرنا فالو نا ممنوع قرار دے دیا گیا ہو تو آخر ایک اسلامی نظریہ رکھنے والی تنظیموں ہی کے لیے یہ طرفہ قانون کیوں گھڑ لیا جائے۔ کب جماعتِ اسلامی نے آپ کو منع کیا ہے کہ آپ اگر اسلامی نظریہ پر کام کرنا چاہیں تو اپنی کسی تنظیم کو اسلام سے منسوب نہ کریں۔ اسلامی نظریہ کی علمبردار اگر یہاں دوسروں جماعتیں بھی ابھر گئیں تو وہ ایک مقصد کے خادموں کی متعاون ٹیمیں بن کر کیوں نہیں کام کر سکتیں! ہم تو سلمیٰ صاحب کو دعوت دیں گے کہ وہ جس تصور کے ساتھ بھی اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہوں، ہم اللہ کریں اور ایک اور اسلامی جماعت کی بنیاد ڈال دیں۔ اس میں جماعتِ اسلامی کا نام بے چارہ کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ اگر حقیقتِ شے کو کسی بے ڈھنگے نام سے

موسوم کر دیا جائے تو بالآخر وہ نام خود ہی اپنے معنی بدل دیتا ہے، مثلاً اگر جماعت اسلامی کا نام آپ کوہ ہمالیہ بھی لکھ دیں گے تو خود لفظ کوہ ہمالیہ کے معنی ایک دن جماعت اسلامی ہو کے رہ جائیں گے۔

جماعتوں کو خلاف قانون قرار دینے کے معنی | لیکن اصل مدعا نام کو نہیں، بلکہ اس نام کے بہانے جماعت اسلامی کی تنظیم اور تحریک کو خلاف قانون قرار دلوانے کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔ سلمی صاحب شوق سے یہ مہم شروع کریں، لیکن وہ اپنے مرتبے کا کچھ ٹھوڑا بہت لحاظ کر کے یہ سوچیں کہ اس قسم کی بات زبان پر لانے کے معنی کیا ہیں۔ ایک جماعت کو خلاف قانون قرار دینا درحقیقت اس کے نسل کا معنی رکھتا ہے۔ جماعت کا قتل ایک نظریے، ایک نصب العین اور ایک پروگرام کو پھانسی دینا ہے۔ آخر وہ یہ پھانسی کس بنیاد پر کسی کو دلوانا چاہتے ہیں — محض اختلافِ ریلے کے گناہ پر! تو پوزیشن وہی ہوئی جیسے کسی علاقے کا کوئی جاہل جاگیردار جب یہ دیکھتا ہے کہ فلاں خود دار آدمی چونکہ میرے دربار میں آکر میری ہاں میں ہاں نہیں ملانا اور میرے عام فحش سے اختلافِ ریلے ظاہر کرتا ہے تو وہ تیج ذناب کھا کر اس کے قتل کرانے کی سازش پر اترتا ہے۔ خود قتل نہیں کر سکتا تو کسی دوسرے کی منت سماجت کرتا ہے کہ کسی طرح یہ کاٹنا کال دو۔ سلمی صاحب غور کریں کہ اگر اسی پوزیشن کو وہ اختیار کرنے والے تھے تو آخر پورے ادارے میں جگہ جگہ آزادی ریلے کا وعظ کہنے کی تک کیا بیٹھی؟

رواداری کی ضرورت پر اتنا کچھ کہہ ڈالنے کے معنی کیا رہے؟ جمہوریت نوازی کے سارے حوصلوں کی پرواز بس

آئی ہی تھی؟

جاگتے ہوئے ضمیر کے ساتھ سوچئے کہ آخراں یہودیوں کی کڑوت آج ہم سے کس بنا پر خراجِ نفیس ہول کر تی ہے؟ جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے لیے سول کی سزا تجویز کی تھی؟ ان جبارانہ زمانہ کے کارناموں کو آج ہم حقارت کی نگاہ سے کیوں دیکھتے ہیں جنہوں نے انسانیت کے بہترین خادموں کو استبداد کے کولھوں میں پیل دیا تھا؟ یورپ کے قرونِ مظلمہ کے ان تنگ دل حکام اور پادریوں کو ہم کیوں کوستے ہیں جنہوں نے گلیلو اور نیوٹن جیسے اہل فکر پر جنسنا تنگ کر دیا؟ ہم ان یونانیوں کو کیوں کڑھن کے ساتھ یاد کرتے ہیں جنہوں نے سفرِ ظاہر کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کر دیا؟ ہم ان علمائے سوا کا نام کیوں ذلت آمیز طریق سے لیتے ہیں جنہوں نے مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں بیٹھے بیٹھے کہ ہر اختلاف کرنے والے کے خلاف فتوے لگائے، چغلیاں کھائیں اور نابول چل گیا تو اس کو موت یا قید خانے کے حوالے

کو لے چھوڑا؟ ان لوگوں کا گناہ صرف تنگ نظری اور کوناہ ظرفی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اختلاف کی برداشت اپنے اندر پیدا کرنے کے بجائے یہ پسند کیا کہ انسانیت کے جو اونچے سے اونچے خادم ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں ان کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ ان لوگوں نے کلمہ حق کہنے والوں، آزادی رائے کا مظاہرہ کرنے والوں اور تنقید کی صدا بلند کرنے والوں کے خلاف طرح طرح کے بہانے تراشے، پچگانہ استدلال گھڑے، نئی سے نئی منطقیں ایجاد کر لیں مذہب اور قانون کی حسب منشا کوئی تعبیر پیدا کر لی اور منتخب روزگار مہنتیوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔

اب دیکھیے کہ یہ آپ کا طبقہ ہے کہ جس کے قبضے میں تخت و تاج ہے۔ خزانے اور ذرائع و وسائل ہیں نشرواعت کی طاقتیں ہیں، ریڈیو اور پریس ہے، لپٹت پر واحد غامذہ جماعت ہے، حمایت میں بے شمار دماغ ہیں، پھر استبدادی قوانین و اختیارات ہیں، پولیس اور فوج ہے۔ دوسری طرف جماعت اسلامی ہے کہ جو تھوڑی سی تعداد اور ان کی جیبوں سے نکلی ہوئی محدود سی رقوم اور ایک روزنامہ اور دو چار ماہانہ اور سہفتہ وار جوائنڈ کے بل پر ایک فکر پیش کر رہی ہے۔ اگر اس کی فکر غلط اور باطل ہے اور اس کا پروگرام ہلک ہے اور وہ واقعی نامعقول طریقوں سے کام لے رہی ہے تو آخر آپ کے اس طبقہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ رواداری کی کھلی فضا میں اتنی ہم گیر طاقتوں سے کام لے کر ایسے شکست نہیں دیتا۔ دلیل کے میدان میں کسی جماعت یا تحریک کو شکست دے دی جائے تو پھر چاہے چند سر چہرے آدمی اس سے کتنے ہی چھٹے رہیں وہ حالات پر اثر انداز ہونے کے قابل نہیں رہتے اور آسنبہ آسنبہ فاتح خیالات کی طاقت ان کو دھکیل کر زندگی کے بعد تریں گوشوں میں بٹھا دیتی ہے۔ مگر اب کیا آپ لوگ دلیل کا میدان واقعی چھوڑ چکے ہیں کہ نوبت جماعت اسلامی کے نقل کے بہانے پیدا کرنے تک پہنچی ہے۔ دنیا کے جس گوشے میں آپ کا یہ ادارہ پڑھا جائے گا، انڈیا، پاکستان کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ ہمارے معیار جمہوریت اور ہمارے ہاں کی رواداری اور ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے ظرف کے بارے میں لوگ کیا اندازے باندھیں گے؟

سوچیے، اور ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ آپ کا یہ حکمران طبقہ وہ ہے کہ جس کی طرف سے جماعت اسلامی کی پچاسوں بار خداز اور تخریب پسند کہا جا چکا ہے اور انڈیا، روس اور امریکہ میں سے ہر ایک کا روپیہ پرومگنڈا کی حد تک کئی کئی بار دلوا یا جا چکا ہے۔ ہم تو یہ سب کچھ سہتے چلے آ رہے ہیں، بلکہ اس سے اوپر یہ کہ سیفی ایکٹ کے بارے پھانسیوں اور قید کی سزائیں ضبطیاں اور زبان بندیاں اور قلم بندیاں سب کچھ صبر سے سہکت رہے ہیں، لیکن دوسری طرف ایک جماعت اسلامی کا نام

آئی ناقابل برداشت چیز ہو گیا ہے کہ آپ جیسے ممتاز صحافی اسے خلاف قانون قرار دینے کے دلائل ادارتی صفحات میں پیش کرتے لگے ہیں۔ خدا سوچے کہ آج جو تاریخ بن رہی ہے اس میں اپنے لیے کیا مقام آپ پیدا کر رہے ہیں۔

مغرب زدہ ذہن | سلمری صاحب کی اس جرات کی ہمارے دل میں بہت قدر پیدا ہوئی کہ آپ نے اس بات کا صاف منہ اعتراف کیا ہے کہ ذہنوں پر غیر ملکی راج اور مغربی فکر و تہذیب کا گہرا اثر موجود ہے۔ لیکن برسرِ اقتدار طبقہ اور معاشرہ کے تعلیم یافتہ عنصر کا اس پہلو سے ڈیفینس کرنے کے بعد فوراً آپ نے دوسری جانب جارحانہ حملہ کر دیا ہے۔ یعنی مذہبی لوگوں کے جدید علوم سے بے بہرہ اور حالات کے تقاضوں سے نا آشنا قرار دے دیا ہے۔ اس موقع پر بھلا مولانا مودودی کو کیسے

نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ مولانا احتشام الحق کے ساتھ ساتھ مولانا مودودی کا نام لے کر ان کی علمی حیثیت پر استہمام انگاری فرمایا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اس سطح پر جا نہیں سکتے کہ کسی کی جہالت اور کسی کی علمیت کا ناپ تول کر سکیں۔ علم اگر کہیں ہوگا تو اپنا اعتراف خود کر لے گا، نہیں ہوگا تو محض نام کے سکے دیر تک نہیں چل سکتے۔ رنج ہوتا ہے کہ یہاں آکر سلمری صاحب ایسی پوزیشن اختیار کی ہے کہ جیسے دو طبقوں کا کوئی طبقاتی جھگڑا ہے اور سلمری صاحب ایک طبقے کے بالمقابل دوسرے کا دفاع کر رہے ہیں۔ اگر حالات کو انہوں نے واقعی اسی طرح سمجھا ہے کہ یہ ملا اور مشرک کشمکش ہے تو قطعی طور پر غلط سمجھا، کم سے کم جماعت اسلامی کی حد تک اگر ان کو پہلے سے معلومات نہیں ہیں تو ہم عرض کریں گے کہ اس کی صفوں میں دونوں طرف کی لوگ اگر جمع ہوئے ہیں، بلکہ جدید طبقے کے حلقوں سے نسبتاً بہت زیادہ تعداد میں لوگوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم لوگ بعض اوقات معیاری علماء کی تعداد کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ یہی بین ثبوت ہے، اس بات کا کہ کشمکش طبقاتی نہیں ہے، ورنہ جماعت اسلامی کے لیے جدید طبقوں کے دروازے طبقاتی تعصب نے کبھی کے بند کر دئے ہوتے۔ معاملہ درحقیقت نہایت زور دار تاریخی تقاضوں اور مستقل نظریوں کی کشمکش کا ہے جسے ہم آخر میں مختصراً واضح کریں گے۔

خیر، اسی سلسلے میں فاضل مدیر اقبال کا ذکر چھڑتے ہیں کہ ایسے چوٹی کے لوگ تو شاذ ہی ہو سکتے ہیں جو ایک ماحول میں پرورش پا کر اور ایک نظام تہذیب کے سخت تعلیم حاصل کر کے اٹھیں اور پھر آزاد ذہن کے ساتھ اسی کی کمزوریوں کی نشان دہی کرتے اور اس کے بالمقابل ایک نئی فکر پیش کرنے کا کارنامہ انجام دیں۔ سب لوگ واقعی اس درجے کے نہیں ہو سکتے، لیکن قدرت ایسے ممتاز افراد سے قوموں کو اسی لیے نوازتی ہے کہ اوسط درجے کے دل و دماغ جو از خود ماحول اور وقت کی

تہذیب کے کمزور پہلوؤں کو نہیں سمجھ سکتے اور ان سے اوپر اٹھنے کے لیے کوئی فکر از خود حاصل نہیں کر سکتے، وہ خاص خاص تاریخی شخصیتوں کی فکر سے اپنے چراغ روشن کریں۔ لیکن آپ اقبال کو اٹھا کر غیر معمولی پن کے اونچے طاق میں رکھ دیتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے اپنے آپ کو ماحول اور تاریخ کے حوالے کر دیتے ہیں کہ ہر کوئی اقبال تو نہیں بن سکتا۔ بلاشبہ ہر کوئی سو اور ماٹلیکیو اور گاندھی اور محمد علی جناح نہیں بن سکتا، مگر ان سے فکر و عمل کا درس تو لے سکتا ہے۔

اقبال مرحوم کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے ملتِ اسلامیہ کے اُس دو گونہ تاریخی ردِ عمل کو سمجھ کر اپنے کلام میں جذب کر لیا جو گذشتہ ایک صدی کے مغرب کے سیاسی و تہذیبی غلبے کے تحت پروان چڑھا۔ ایک طرف اُس نے دورِ جدید کے مطالبہ سے علم و عمل کے میدانوں میں ترقی کرنے، حالات سے کشمکش کرنے، قوتوں کو سخر کرنے، جدید ذرائع و وسائل سے کام لینے اور جدید ادارت سے استفادہ کرنے کا وہ سبق لیا جو خود اسلام کا پڑھایا ہوا سبق تھا۔ دوسری طرف اُس نے نظامِ حیات کی بنیاد بنانے کے لیے مغرب کی مروجہ سبیت سے بالاتر ہو کر اسلامی اصولِ فکر کو بغیر کسی مذمت و معذرت کے اپنایا۔ یہ دونوں تاریخی رجحانات خود ملتِ اسلامیہ کے اندر مغربی غلبے کے ردِ عمل سے پیدا ہو کر نمایاں ہو رہے تھے مگر دھندلے اور نیم شعوری تھے۔ اقبال نے ان کو اجاگر کر دیا اور اس طرح اس کے کلام نے تعمیر نو کے لیے ایک صحیح راستے کی نشان دہی کر دی۔ اس لحاظ سے اقبال کو دیکھیں تو وہ ہمارے قدیم مذہبی طبقے اور جدید روشن دماغ طبقے کے درمیان ایک لیے وسطی مقام پر کھڑا نظر آتا ہے جہاں دونوں اپنے آپ کو لاکر جمع کر سکتے ہیں اور ملت کی ساری طاقت یک جہتی سے تعمیر نو میں لگ سکتی ہے۔

اقبال اس وسطی مقام پر کھڑے ہو کر ایک فکری تحریک کر کے رخصت ہو گیا۔ بعد میں ٹھیک وہی موقف ہے جسے عملی تحریک کے میدان میں جماعتِ اسلامی نے اختیار کیا ہے۔ ورنہ اگر معاملہ مسٹر اور ملا کی طبقاتی کشمکش تک رہ گیا ہوتا تو اس سے پہلے دونوں طرح کی جماعتیں اور ادارات موجود تھیں، تاریخ میں کوئی خلا نہ تھا۔ کسی جماعت اور تحریک کے لیے اگر خلا رہتا تو اسی صورت کے لیے تھا کہ دونوں قسم کے متضاد رجحانات کے درمیان کوئی طاقت اقبال کا نشان زد کردہ مقامِ اعتدال سنبھال کے کھڑی ہو۔ چنانچہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی ایک طرف جو عظیم میں آگے بڑھنے، جدید ادارات سے استفادہ کرنے اور جدید ذرائع و وسائل کو کام میں لانے اور گرد و پیش کے حالات کو سمجھنے اور ان کا لحاظ رکھنے کا مسلک اختیار کرتے ہوئے ہے اور دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ تعمیر نو اسلامی فکر و عمل

کی اساس پر سب سے زیادہ حقیقت جماعت اسلامی ایک تاریخی تقاضے کا ظہور ہے اور یہ تاریخی تقاضا اتنا ملتا گیز ہے کہ ہر ملک میں یہ کسی نہ کسی تحریک کی شکل میں نمودار ہو رہا ہے۔ اتنی بات البتہ درست ہے کہ یہ ہمہ گیر تاریخی تقاضا رائے عام کی پوری تائید اپنے ساتھ لے کر جس بھی شکل میں جہاں نمودار ہو رہا ہے، حکمران کلاس بہت برا فرختہ ہو کر اس سے لڑ رہی ہے یعنی معاملہ مسٹر اور ملا کی کشمکش کا نہیں، بلکہ عوامی رجحانات اور حکمران کلاس کی کشمکش کا ہے۔ کاش کہ اگر یہ طبقہ کشمکش کا راستہ اختیار نہ کرے تو تعاون کے لیے خطا اعتدال سامنے موجود ہے۔

ایک متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی | اس سلسلے میں فاضل مدیر نے ایک متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی دینے پر اعتراض کیا ہے موصوف کی رائے یہ ہے کہ بس لوگ قرآن پڑھیں اور جدید علوم کے حصول میں لگ جائیں، جوں جوں افراد کے خیالات بنیں گے، ریاست اور معاشرہ ان کے ذریعے خود بخود اپنے آپ کو کسی شکل میں تعمیر کرنا جائے گا۔ اس سلسلہ کلام میں آپ فرماتے ہیں کہ کسی صورت میں بھی ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ آئے الی نسلوں کو نام نہاد اسلامی قوانین کی بیڑیوں میں جکڑ جائیں اگر آپ ان بیڑیوں میں آئندہ نسلوں کو جکڑ جانے کا حق نہیں رکھتے تو آخر نام نہاد غیر اسلامی قوانین کی بیڑیوں میں جکڑ جانے کا حق کہاں سے حاصل ہو جاتا ہے! پھر تو چاہیے کہ آپ معاملہ بالکل ہوا میں متعلق چھوڑ دیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا آئندہ نسلوں کے نام پر موجود نسلوں کو ان قوانین سے محروم رکھنا برحق ہو گا جس پر وہ ایمان رکھتی ہیں اور جن کو خالص دہبود کا ضامن سمجھتی ہیں آپ کہہ سکتے ہیں کہ نہیں موجودہ نسلیں ان پر ایمان نہیں رکھتیں۔ لیکن اس اختلاف رائے کا فیصلہ کون کرے گا؟ اگر دینی فیصلہ کرنے والے ہیں جن کو آپ آخری امتحان قرار دیتے ہیں تو ہم عرض کریں گے کہ براہ کرم اپنا یہی فقہ، بلکہ اپنے یہ الفاظ "نام نہاد اسلامی قوانین کی بیڑیاں" قوم کے سامنے پیش کر کے استصواب کر لیجئے کہ کتنے افراد اس میں ایسے پائے جاتے ہیں جو اس طرز پر سوچتے ہیں اور یہ الفاظ اسلامی قوانین کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ ان الفاظ میں جو ذہن بول رہا ہے، عوام کے کتنے ووٹ اس ذہن کے حق میں پڑیں گے۔ لیکن آپ کی توجہ ان الفاظ کو لکھتے وقت عوام کی طرف کبھی نہیں ہو سکتی، آپ نے تو اپنی طرف سے ایک قطعی فیصلہ دے دیا ہے اور انداز السیاسہ ہے کہ اسے زبردستی ملک بھر پر ٹھونسنا چاہتے ہیں "متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی" کا معاملہ یہ ہے کہ جب تک کوئی بات محض خطابت و صحافت کے میدان میں کی جاتی رہتی ہے، قطعیت اور تعین کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیکن جب معاملہ دستور بنانے، تعمیر معاشرہ کا خاکہ تیار کرنے اور ایک سیاسی نظام برپا کرنے کا ہوتا ہے تو ڈھیل ڈھالی باتوں کو قطعیت اور تعین کی طرف لانا پڑتا ہے۔ اگر کوئی حساباً

ودعوت خود تعین کی طرف نہ جانا چاہیے اور محض اصولی گفتگو تک اپنے آپ کو محدود رکھے تو مخاطب خود تعین کا
 تھا صاف کرتا ہے۔ مثلاً یہی صورت عملاً جماعت اسلامی کو پیش آئی۔ اس نے کہا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کیا جانا
 چاہیے۔ اس پر سوال ہوا کہ تفصیل سے بتائیے کہ وہ ہوتا کیا ہے۔ ادھر سے کہا گیا کہ دستور کو اسلامی بنیادوں پر بننا
 چاہیے۔ دریافت کیا گیا کہ وہ اسلامی بنیادیں کیا ہوتی ہیں۔ چاہا گیا کہ معاشی مفاسد کی اصلاح اسلامی نظریات کے مطابق
 کی جائے۔ اس پر پوچھا جانے لگا کہ وہ اسلامی نظریات کیا ہیں اور ان سے معاشی مسائل کیسے حل ہو سکتے ہیں۔ پھر حیب
 دعوت دی گئی کہ سو کو حرام ہونا چاہیے تو جرح ہوئی کہ اس کے بغیر بنگلہ سٹم کے لیے کیا نقشہ دینے ہو۔ اسی طرح کرید اور
 نفخ اور کثرت سوال نے آہستہ آہستہ پھیلے ہوئے نظریات کو تعین تک پہنچایا ہے اور یہ بالکل فطری صورت دور تعمیر میں
 دنیا کے ہر گوشے اور زمانے میں پیش آئی ہے۔ خود ہی آپ لوگوں نے پہلے اس تعین کے لیے ہر معاملے میں اصرار کیا
 اور اب خود ہی طعنے دیتے ہیں کہ ہمیں کوئی متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی نہیں چاہیے۔ ہم تو لوگوں مول باتیں پسند کرتے ہیں۔
 گول مول باتوں سے تعبیر نہیں ہوتی۔ ایک متعین رہنمائی آپ کو لپہ نہیں آئی تو آپ کوئی دوسری متعین رہنمائی ہم پہنچائیں اور
 پھر فیصلہ عوام پر چھوڑ دیں۔ خود کوئی متعین سپردے نہیں سکتے اور دوسروں سے لینے پر تیار نہیں۔ اس سچیدگی کا حل کیا
 اداریئے پر تبصرہ ہو چکا، لیکن آخر میں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ سلمری صاحب کے چھپڑے ہوئے مسائل کی لڑائی میں انٹر
 اصل قابل حل مسئلہ کو سامنے لائیں۔ سلمری صاحب اپنے ادارے میں اس وسیع موضوع فکر کو صرف باہری باہر سے مس
 کر سکے ہیں لیکن اس کے اندر اتنے نہیں سکے، کیونکہ درحقیقت ان کی تمام تر توجہ ہمارے اہم ترین تاریخی دہلی پر اہم سے پیدا
 ہونے والی سطحی بحثوں پر مرکوز رہ گئی ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس بھاری پر اہم پر نگاہ ڈال کر اسے سمجھ سکے ہوں۔
 ملت اسلامیہ پچھلے دو تین قزوں سے غلامی کے خلاف جدوجہد کرتی ہوئی کرہ اضی کے ہر گوشے میں آزادی سے
 ہم کنار ہو رہی ہے۔ آزادی کا آفتاب جب کسی سرزمین پر چمکا اٹھتا ہے تو احساسات جاگ اٹھتے ہیں، ولولے کو پیش
 لیتے ہیں، عزائم ابھرنے لگتے ہیں اور جو کچھ فکر و شعور سمجھے سے بنا چلا آیا ہو وہ زندگی کی باگ ڈور تھامنے کے لیے
 میدان میں آجاتا ہے۔ پاکستان بھی آزادی کی صبح سے دوچار ہے۔ قدرتی طور پر اجتماعی زندگی حرکت اور اقدام اور
 نشوونما چاہتی ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے کہ جب پیدا ہو جاتی ہے تو حالات کی رو کو اس جگہ روک کر نہیں رکھا
 جا سکتا جہاں وہ پہلے سے رخ لبتہ ہو کر گھڑی تھی۔ صبح کی شعاعوں کی گرمی نے رخ کو گھجلا کر سیال بنا دیا ہے اور

ہر سبیل چیز بہنا چاہتی ہے۔ آزادی نے ارادوں کو جگا دیا ہے اور سر جگتہ بوا ارادہ اقدام کرنا چاہتا ہے جس حالت میں ہم آج کھڑے ہیں اس پر کسی ایک فرد کے اندر بھی اطمینان باقی نہیں رہا۔ قوم کا اجتماعی ذہن تبدیل چاہتا ہے۔ تاریخ کو ہم بھگتہ بند کر کے موجودہ مقام پر کھڑا نہیں رکھ سکتے۔

لیکن اسے کس رخ پر آگے بڑھنے کا راستہ بنا کے دیا جائے؟

سب سے پہلے مغربی فرد تمدن کی کشش ہمارے سامنے آتی ہے۔ ہم میں سے بعض لوگ چاہتے ہیں اور شاید خیر خواہی ہی کے جذبے سے چاہتے ہیں کہ ہماری قوم کو قدم بہ قدم ازراہ مغرب کے پیچھے سیدھے مادہ پرستانہ فکر و تمدن کی راہ پر بڑھا جانا چاہیے۔ یہی راہ ترقی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ محض چند افراد۔۔۔ ذہین سے ذہین اور خیر اندیش سے خیر اندیش افراد۔ کا چاہنا اس معاملے میں فیصلہ کن نہیں ہو سکتا۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اجتماعی شعور و ارادہ تاریخی عوامل کی زیر اثر کیا میلانات اختیار کر چکا ہے۔ اس لحاظ سے حالات پر کوئی رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کی سطح پر پیرتے رہنے کے بجائے اس کی گہرائیوں کی خواہی کی جائے اور حکیمانہ غیر جانبداری سے کھوج لگا یا جائے کہ اس سمندر کی تہ میں کیا ہے جو اچھلنا چاہتا ہے۔

چند تاریخی حقیقتیں | اس عظیم مسئلے کی تحقیق کے لیے اندر اتر بیٹے تو چند اہم حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں :

ایک یہ کہ ہماری قوم مجموعی حیثیت سے اپنے مسلم ہونے کا احساس رکھتی ہے اور گہرا احساس رکھتی ہے۔ یہ احساس سخت درجے کے ناسازگار حالات میں بھی مٹ نہیں سکا بلکہ اس کی دو تک انہی ہوئی جڑیں برابر نڈا حاصل کرتی رہی ہیں۔ دوسرے یہ کہ جہاں بلحاظ ایمان و عقیدہ اسلام کا پیرو اور علمبردار ہونے کا یہ احساس مرا نہیں ہے، وہاں دوسری طرف یہ شعور بھی افراد اور معاشرہ کے اجتماعی ذہن میں موجود ہے کہ ہماری عملی زندگی اور ہمارا اجتماعی نظام اسلامی بہ حال نہیں ہے۔ فراری ذوق نے اس شعور سے بچنے کے لیے ہزار پناہ گاہیں گذشتہ صدیوں میں تعمیر کیں، لیکن اس شعور کے حملے کی زد سے بچنا ممکن نہیں ہو سکا۔ اس شعور کو زندہ رکھنے میں قرآن و حدیث کے مطالعہ نے اصل پارٹ ادا کیا ہے۔

اس کے ساتھ مسلمان چونکہ اسلامی نظام کے دو سعادت کی زین تاریخ کا ایک ایک باب نہایت محفوظ شکل میں سینوں سے لگائے چلائے آ رہے ہیں اور یہ تاریخ جوان کے لٹریچر، ان کے ادب، ان کی صحافت، ان کی خطابت میں پوری طرح رچی بسی ہوئی ہے، زندگی کے ایک ایک پہلو کے بارے میں۔۔۔ ان کو بول بول کے کہتی ہے کہ یہاں فلاں فلاں انحراف

کار فرما ہے۔

تیسرے یہ کہ اس قوم کا یہ احساس و شعور محض زینتِ دماغ نہیں بنا رہا بلکہ اس نے بار بار ذوقِ تغیر اس کے اندر پیدا کیا ہے اور اس ذوقِ تغیر نے یکے بعد دیگرے تجدید و احیائے اسلام کی تحریکیں اس کے دائرے میں برپا کر دی ہیں ان تحریکوں کا یہ نتیجہ بہ حال نکلا ہے کہ ذوقِ تغیر کی یہ لہر ہمیشہ موجود رہی ہے اور اپنا تاریخی اثر رکھتی ہے۔

چوتھے یہ کہ یہ مسلمان ہونے کا احساس اور عملاً اسلام سے بڑے ہونے کا چھینٹا ہوا شعور ایسی منزلتائیں ہیں کہ مسلمان ان کے بل پر ایک ایک ملک میں امپیریلزم اور سامراج کے خلاف لمبی لڑائیاں لڑنے میں اور لڑ رہے ہیں۔ جب بھی وہ

مختار ہوئے ہیں، جب بھی متحرک ہوئے ہیں اور جب بھی انہوں نے قربانیاں دی ہیں اسلامی آئیڈیالوجی کی مثبت میں دی ہیں۔ بار بار کے تجربوں نے ان پر ثابت کر دیا ہے کہ یہی ان کی زندگی، ترقی اور سرگرمی کا اصل سرچشمہ ہے۔ پھر چونکہ

آزادی کو انہوں نے فی نفسہ نصب العین بنا کر کبھی بھی کام نہیں کیا بلکہ کھوئی ہوئی اسلامی زندگی کو پالنے کی تمنا میں آزادی کو ایک ذریعہ و وسیلہ کی حیثیت سے چاہا ہے اس لیے ہر جگہ تعمیر نو کے لیے سب کی نگاہیں اسی آئیڈیالوجی پر مرکوز ہیں۔

پانچویں یہ کہ مغربی فکر و تمدن کے تسلط نے دوسری ایشیائی قوموں کا ذہن جس طرح اپنے سانچے میں کامیابی سے ڈھال لیا ہے اور ان میں مادہ پرستانہ قومی سیکولر نظاموں کے لیے ایک واضح میلان پیدا کر دیا ہے، مسلمانوں پر اسے طبعی

کامیابی نہیں ہوگی۔ اگرچہ مسلمان معاشروں پر اس کے گہرے اثرات پڑے ہیں اور چھوٹا مٹا ہوا ایک نہ ایک طبقہ ان میں مغربی اثرات کے سامنے بڑی حد تک مضبوط ضرور ہوا ہے، لیکن اسلامی آئیڈیالوجی کی ڈھال لے کر قوم کے اجتماعی ذہن فکر نے اپنے آپ کو مغربی فکر و تمدن کے حملوں سے بچا لیا ہے۔ مسلمانوں میں مرعوبیت اور تقلید کا ایک حد تک پر تو ضرور

پڑا ہے لیکن پوری طرح تنہا رد کرنے کی زینت نہیں آئی۔ وہ مخالف اسلام اثرات کے خلاف برابر لڑ رہے ہیں اور یہ لڑائی جاری ہے۔

چھٹے یہ کہ مغربی فکر و تمدن کا تجربہ اب اس حد تک مکمل ہو چکا ہے کہ اس کے کمزور اور فاسد پہلوؤں کے نتائج اور بہت ہی تلخ اور نباہ کن نتائج۔۔۔ ابھرا ہوا کر سامنے آ رہے ہیں۔ ان نتائج کی تنگی اور نیاہ کاری کو خود اہل مغرب محسوس کر رہے ہیں اور نت نئی پیچیدگیوں کے پیش آنے پر وہاں کے اربابِ علم و حکمت خود پریشان ہو رہے ہیں۔ اس صورتِ حالات نے مسلمانوں کو بروقت متنبہ کر دیا ہے۔

یہیں وہ تاریخی حقیقتیں جن کے ہمہ گیر اثرات نے ہمارے اجتماعی ذہن میں اسلامی فکر اور اسلامی نظریے کو پوری مضبوطی جمادیا ہے۔ یہ قوم کہیں بھی ہو، نہ مادہ پرستانہ نقطہ نظر اختیار کر سکتی ہے، نہ وطنی قومیت کو دل میں جگہ دے سکتی ہے نہ یکو لرازم کو قبول کرنے پر تیار ہو سکتی ہے، نہ مغربی فکر و تمدن کی اندھی تقلید کر سکتی ہے، نہ کمپوززم کو جذب کر سکتی ہے اور نہ موجودہ حالت پر تہمت لہنے ہو کے بڑی رہ سکتی ہے۔ یہ قطعی طور پر اسلامی نظام زندگی ہی کی جانب رخ کر کے نیا سفر حیات شروع کر سکتی ہے۔ یہ صورت حال کسی ایک ملک کے لیے خاص نہیں، کہہ ارضی کی تمام مسلمان آبادی اسی تاریخی کیفیت سے گذر رہی ہے۔ اسی تاریخی کیفیت نے ہر جگہ اسلامی تحریکیں برپا کر دی ہیں۔

تضاد اور کشمکش اس سوال یہ ہے کہ پھر یہ حرکت کیوں نہیں شروع ہوتی، اس میں رکاوٹ کیا ہے؟ رکاوٹ صرف یہ ہے کہ ہر جگہ بنیاد کی باگ ڈور پہلے سے ایسے ایک طبقے کے ہاتھ میں ہے جو کچھ تو اپنے مناصب اور مفاد کی خاطر اور کچھ اپنے مغرب کے قبول کردہ جدید نظریات کے زیر اثر اجتماعی ذہن کے تاریخی رجحانات کا ساتھ نہیں دے رہا۔ یہ طبقہ عوامی میلانات اپنی توجہ کے تحت لے کے چلنا چاہتا ہے، اور چونکہ وہ اس سمت نہیں چلتے، لہذا ان کو کسی دوسری طرف بڑھنے سے روک رکھنا چاہتا ہے اسے بڑی غلط فہمی ہے کہ کبھی یہ اس کیفیت کو کسی فرد کی شرارت قرار دیتا ہے، کبھی سمجھتا ہے کہ یہ چند ملاؤں کا فتنہ ہے اور کبھی رائے قائم کرتا ہے کہ یہ فلاں دینی تنظیم کا اٹھایا ہوا طوفانِ فساد ہے۔ حالانکہ ایسے میوٹارکائی عوامل جب کام کرنے لگتے ہیں تو افراد اور تنظیموں کا پارٹ بجز اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ان عوامل کے لیے ظاہری ذریعہ اظہار اور وسیلہ کار بنیتے ہیں۔ اس غلط جائزہ کی وجہ سے وہ عجیب مغرب تضاد اور وہ دلچسپ کشمکش نمودار ہوتی ہے جس میں ایک طرف ہماری ہزار سالہ تاریخی فریق بنی کام کر رہی ہے اور دوسری طرف ایک مختصر سا طبقہ اس کے سامنے مدافعتانہ پوزیشن لیے ہوئے ہے۔

یہ ہے وہ تاریخی تضاد (HISTORICAL CONFLICT) جو اصل عظیم مسئلہ ہے اور فوری طور پر قابل حل مسئلہ ہے۔ یہ وہ توجہ طلب صورت واقعہ ہے جس پر ہمارے اونچے دماغوں کو فکر و کاوش کی ساری قوتیں صرف کر دینی چاہیں۔ مصر میں انون کو پھانسی پڑھا دینے اور پاکستان میں جماعت اسلامی کو خلاف قانون قرار دینے سے یہ گروہ بہ حال نہیں سلجھ سکتی۔ کسی کے پاس کوئی ایسا آمرانہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اس تاریخی تضاد و کشمکش کو تختہ دار پر لٹکا سکے اور کسی کے ہاتھ میں کوئی ایسی پاد نہیں ہے کہ اس عظیم مسئلے کو خلاف قانون قرار دے سکے۔ ہم سلمی صاحب سے بھی اور دوسرے تمام سوچنے سمجھنے والے

حضرات سے بھی درخواست کرنا چاہتے ہیں کہ اس عملِ گنہگار کو سلجھائیے۔

دو حل | یہ لایعنی نہیں ہے، بس صرف توجہ کی دیر ہے اگر ہمارے ذہن لوگ کشمکش کے سطحی مظاہر سے نیچے اتر کر اصل دہر کشمکش سے نجات پانے کی فکر کریں تو نہ کسی انوائن المسلمون سے پھر کوئی خطرہ رہ جاتا ہے، نہ کسی جماعت اسلامی کے وجود پر اضطراب!

اس کا ایک حل یہ ہے کہ کسی تدبیر سے مسلمان قوم کو مسلمان ہونے کے احساس اور اسلامی زندگی کے شعور اور اس تک پہنچنے کی تمنا سے خالی کر دیجیے۔ اس کے بعد جو کچھ آپ چاہتے ہیں وہ ہو جائے گا اور کوئی ترغیب باقی نہیں رہے گا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ خصوصاً جب تک قرآن موجود ہے، جب تک حدیث اور سنت کا ریکارڈ محفوظ ہے، جب تک دور رسالت کی تاریخ قوم کے حافظے پر ثبت ہے، جب تک اسلام کی روایات اور قدسی ہمارے لٹریچر، ہماری صحافت اور ہماری خطابت میں رچی بسی رہی ہے، یہ قطعاً ناممکن ہے! اسے اگر سطحی نظر کے ساتھ آپ ممکن تصور کریں اور جس وقت سے قومی مزاج بدلنے کی کوشش شروع کر دیں تو ایک تو مسلمان قوم کے اپنے ہی خون سے آپ کو ہاتھ رنگتے ہوں گے، اسلامی رجحانات کو نہایت سخت گیرانہ طریق سے مسلسل دبانا ہوگا، اور چونکہ یہ بالکل مر نہیں سکتے اس لیے ہمیشہ ان کے درپے رہنا ہوگا، اپنی قوم سے معاملات کو سالہا سال کے لیے بگاڑنا ہوگا اور اس طرح کی لمبی کشمکش میں عمریں گزارنے کے لیے جمہوری نضاً کو ختم کرنا ہوگا۔

اب سوچئے کہ اس جہدک اور تباہ کن حل کو اختیار کرنے کے دور رس نتائج کیا نکلیں گے؟ ملکی حالات مصر و ایران کے معیار پر جا کر سیکے اور بین الاقوامی لحاظ سے قومی و فخر ختم ہو جائے گا۔ قوم کے دل و لہجے کے رہ جائیں گے اور اس کی طاقتوں کو کسی بڑی تعمیری مہم میں استعمال نہ کیا جاسکے گا۔ آگے چل کے جب مزید رد عمل پیدا ہوں گے تو کمیونزم جیسے فتنوں کو آئیڈیالوجی کے خلاف کی وجہ سے حملہ کرنے کا موقع ملے گا۔ اس وقت بجاؤ کرنے والی کوئی فکری طاقت موجود نہ ہوگی۔ علاوہ بریں بین الاقوامی توڑ پھوڑ کے منہگامے میں اگر خدا نخواستہ کوئی بڑا حادثہ قوم کو پیش آگیا تو اس سے عمدہ برا ہونے کے لیے کوئی مؤثر ذمہ داری و اخلاقی سامانِ دفاع ہم نہ پہنچ سکے گا۔ بیسیوں سال ای حائثِ تعطل میں گزر جائیں گے اور قوم اپنی سے نہ نکل سکے گی۔ لیکن بیسیوں سال کے بعد بھی جب آپ جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی رجحان اب تک بھی مرا نہیں ہے بلکہ وہ خطرہ بدستور اپنی جگہ پر قائم ہے۔ جیسے کہ تزکیہ میں تیس تیس سال کا عرصہ اسلامی رجحان کے خلاف حکمران طاقت نے معرکہ آرائی میں صرف کر دیا اور آج بھی وہاں حال یہ ہے کہ یہ رجحان بدستور کام کر رہا ہے اور اسے کچلنے کے لیے برابر قوم کا سرمایہ قوت برباد کیا

جانا رہتا ہے۔ ذرا اگر جمہوریت کی فضا پیدا ہو جائے تو فوراً یہ ایک مضبوط تحریک کی شکل اختیار کر جائے گا۔ سوچئے کہ قومی قوتوں کو اس بے جا کشمکش میں جھونکتے رہنے کا حاصل کیا ہوا ہے۔

دوسرا اصل یہ ہے کہ حکمران طبقہ ذرا سی لچک اپنے اندر پیدا کر لے اور نظریاتی ضد چھوڑ دے۔ وہ یہ حقیقت تسلیم کر لے کہ قوم میں اسلامی نظام زندگی کے لیے عوامی تقاضا کارفرما ہے۔ وہ اس تقاضے کو لوح تاریخ پر باریک نظر سے پڑھے اور اسے قبول کر لے۔ بس فکر و نظری ذرا سی یہ تبدیلی اور ضد مٹانے کے جذبات کی معمولی سی یہ قربانی صورتِ حالات کا پورا نقشہ بدل کے رکھ سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا حل ہے کہ جو تاریخی تضاد و کشمکش کا خاتمہ کر کے ملت کی تمام طاقتوں کو ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ اس حل کو اختیار کرنے سے قوم کو آئیڈیالوجی کی قوت محرکہ مل جاتی ہے، اسے ایک نئے اتحاد ہاتھ آتی ہے اسے ترقی کرنے کے لیے ایک رہنما قوت بہم پہنچ جاتی ہے، اور وہ دنیا کی عظیم قوموں کی صف میں شامل ہونے کے لیے تیار ہو سکتی ہے۔ اس حل کو قبول کر لینے سے ہمیں وہ پختیار مل جاتا ہے جس سے کمینوزم اور دوسرے باطل نظریات کے حملوں کو روکا جاسکے۔ اس صورت میں ہم ایک ایسی طاقت سے مالا مال ہو جاتے ہیں جو ہمیں بین الاقوامی حادثات کے طوفان میں چٹان کی ہی مضبوطی کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے۔

ہم مسلم لی صاحب اور اپنے اکابر اور اس طبقے کے تمام ذہین لوگوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس حل پر غور کریں۔ آخر کیوں یہ بات بالکل ناممکن قرار دے دی گئی ہے کہ ملت پر اثر انداز ہونے والے تاریخی تقاضوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاسکتا اور کیوں یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ اسلامی تحریکوں کا خون بہا کر ہی آگے چلا جاسکتا ہے جو ناکام اور احمقانہ حلِ ناصری آمریت نے اختیار کیا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستان کے اکابر بھی اسی کو قابلِ تقلید مثال بنا لیں؟

لے چنانچہ ذمہ تدبیر و ستور سے لوگوں کو یہی امیدیں تھیں کہ اس کے نفاذ سے ہم مذکورہ بالا تاریخی تضاد و کشمکش سے نجات پا کر ایک متحدہ طاقت کی حیثیت سے کام کر سکیں گے۔

لے غور فرمائیے کہ بنو امیہ کے عہد سے لے کر آج تک ذرا سی راج مہٹ کے لیے امت کے بہترین عناصر کا جتنا خون بہایا گیا ہے اور اس دور میں بھی ترقیہ اور مصر میں ملتِ اسلامیہ کی جس فعال طاقت کو دریا برد کیا گیا اور کیا جارہا ہے، پھر خود پاکستان میں بھی عدم تعاون کی نہیں تشدد کر کے دینی طاقتوں کو جتنا کمزور کیا جارہا ہے، اگر اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کی ہم اس طرح جاری نہ رکھی جاتی تو ہماری توتِ تعمیر کنٹی ٹری ہوتی اور ہم اپنے موجودہ مقام سے کتنے آگے ہوتے۔

کوئی نہیں کہنا کہ جدید حالات اور تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے چلئے، کسی میں یہ انہما پندی کا رد نہیں ہے کہہ کرے گا پورا اسلام آنا فانا یہاں سے وہاں تک چھا جائے، بلکہ سب لوگ تدریج کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں، کوئی نہیں چاہتا کہ وہی تن تنہا سب کچھ (ALL IN ALL) ہو، کسی کو موجودہ حکمرانوں سے کوئی بیڑا اور کد نہیں ہے کہ ان کو ضرور ان کے مناصب سے ہٹانا ہے اور اسلام کا نام ہی کد کو پورا کرنے کے لیے نقاب فریب کے طور پر استعمال کرنا ہے۔ آپ لوگ دوسروں کو سمجھنے کی کوشش کیجیے اور قومی عناصر اور طاقتوں کو باہم دگر بھاڑیے نہیں بلکہ زبان و قلم سے ان کو قریب تر کرنے کی فکر کیجئے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اسلام کو کسی درجے میں اپنائیے اور خلوص سے اپنائیے اور پھر تھوڑا یا بہت عملی کام کر کے دکھائیے جس دن آئی تبدیلی کا ثبوت ہمارے اکابر نے دے دیا اُس دن بالکل نئے جذبات اور نئے حالات کے سرختمیے پھوٹ پڑیں گے۔ جو شخص اس صف میں سب سے پہلے آگے بڑھ کر یہ تجربہ کرے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ اس کے کتنے اچھے نتائج سامنے آتے ہیں اور کتنی بڑی قبولیت عامہ اس کا خیر مقدم کرتی ہے۔ سلمیٰ صاحبہ نے درخواست کی کہ وہ اوپر کی بحث سے اگر کوئی ناگوار اثر بھی لیں تو اسے اس موقع پر زمین سے الگ کر کے ان نقاطِ فکر کے مطابق بھی ذرا غور فرمائیں۔ پہلے حل اور دوسرے حل کے نتائج کے فرق کا جائزہ لیں۔ پھر اپنے ہی سامنے یہ سوال رکھیں کہ کیا یہ دوسری صورت بالکل ناممکن ہے ؟

سلاجقتہ

(سید ابوالاعلیٰ مودودی)

دولتِ عباسیہ کے سیاسی زوال کے بعد جس سلطنت نے ممالکِ اسلامیہ کے بیشتر حصہ کو ایک مرکز پر جمع کیا اور مسلمانوں کی سیاسی افشار اور پراگندگی سے نکال کر دنیا کے سامنے عالمِ انسانی کا رہنما اور امام بنا کر آخری مرتبہ پیش کیا وہ سلجوقی سلطنت تھی اس کے کارنامے مولانا کی اس تاریخی کتاب میں ملاحظہ کیجئے۔ قیمت : ۳/۸

طاہر رسول قادری، سول ایجنٹ، ۸۱ پیرغازی روڈ، اچھڑ، لاہور

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی (پاکستان) اور اپنے شہر کے کتب فروشوں سے حاصل فرمائیں